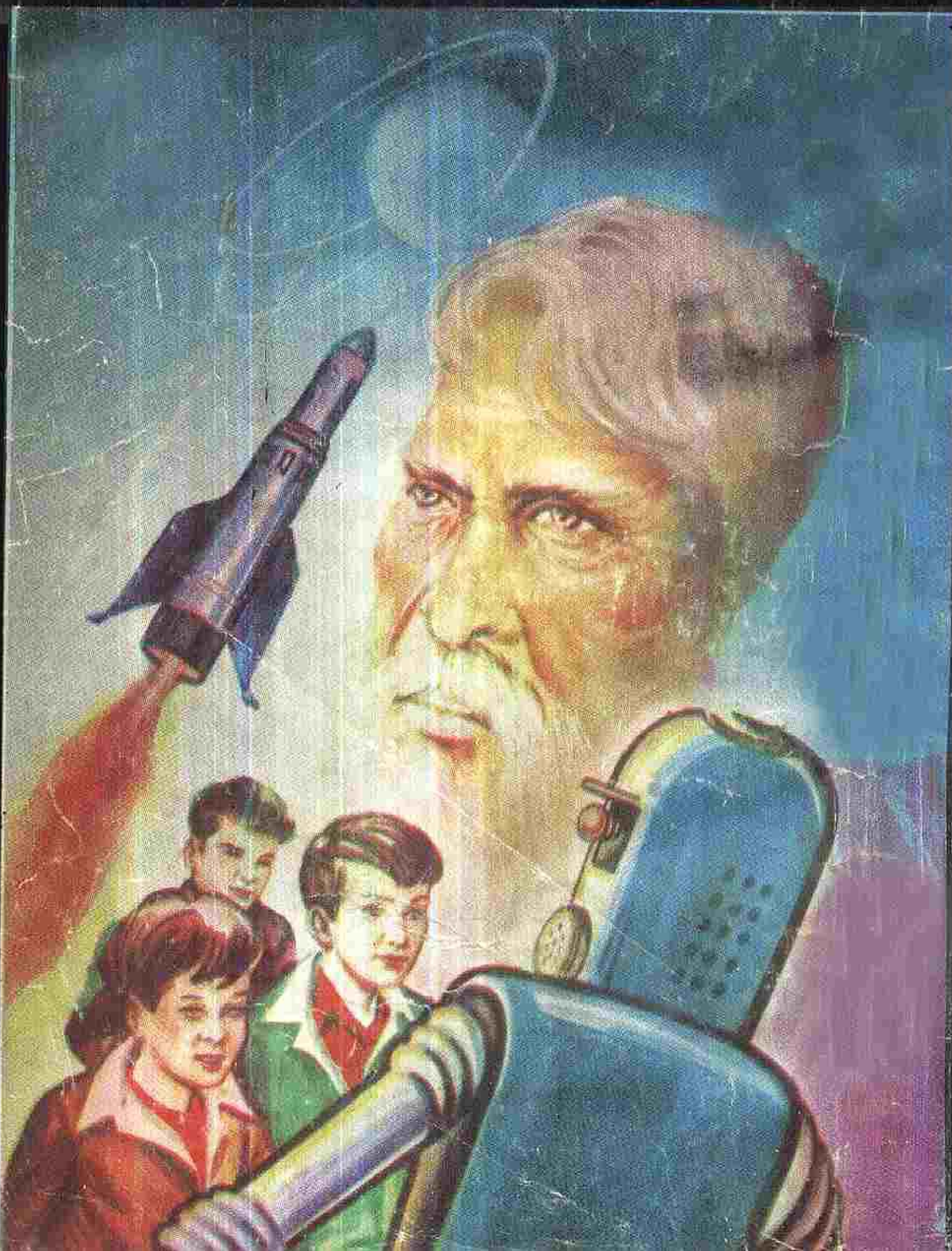
ستاروں کی سیر

کرشن چندر کا
سائنسی ناول



ستاروں کی سیر

کرشن چندر

(جولائی 1961)

مقدمہ

ڈاکٹر خوشحال زیدی

اردو میں دوسری اصناف نثر کی طرح بچوں کا ادب برابر لکھا جا رہا ہے۔ اردو کے تقریباً ہر بڑے شاعر اور بلند پایہ ادیب نے ادب اطفال کی طرف خاطر خواہ توجہ کی اور نظم و نثر میں بے شمار نگارشات چھوڑی ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد ادب اطفال کے موضوعات بدلے، اسلوب بدلے، مسائل بدلے ہیں، اس عہد کے تمام لکھنے والوں نے ادب اطفال میں بھی ان تمام موضوعات مسائل کا احاطہ کیا ہے، اس ضمن میں عظیم افسانہ نگار کرشن چندر کا نام سرفہرست ہے۔

کرشن چندر نے بچوں کے لئے فنطاسیہ، مہماتی اور سائنس فکشن تخلیق کیا ہے۔ انہوں نے اپنی ایسی نگارشات میں بھی شعریت آمیز نثر استعمال کر کے ، ان کو دلچسپ، خوبصورت اور زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ کرشن چندر کی زیادہ تر کہانیاں اور ناول تمثیلی اور طنزیہ ہیں جن میں مزاح کی لطیف چاشنی سے مقصدیت کو خوشگوار بنایا گیا ہے۔ ان کی تخلیقات ، زبان، اسلوب، طرز نگارش غرض کہ ہر اعتبار سے بچوں کے مزاج اور افتادِ طبع سے ہم آہنگ ہیں۔ کرشن چندر بچوں کی نفسیاتی پیچیدگیوں، ذاتی ضروریات اور دلچسپیوں کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کرشن چندر اردو ادب اطفال میں بھی کئی حیثیتوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے بچوں کے لئے ڈرامے بھی لکھے ہیں اور بہترین ناول بھی۔ وہ بچوں کے سب سے بڑے اور سب سے پہلے کہانی لکھنے والوں میں سے ہیں جنہوں نے جدید سائنسی اور صنعتی دنیا کے پس منظر میں بچوں کو عجیب و غریب دنیا کی سیر کرائی ہے۔

دور جدید میں بچہ مافوق الفطرت واقعات اور کرداروں کی بہ نسبت نئی نئی ایجادات اور خلائی معلومات میں زیادہ دلچسپی لینے لگا ہے۔ وہ بے بنیاد باتوں پر یقین کرنے پر آمادہ نہیں ، یہی سبب ہے کہ عصر حاضر میں سائنس فکشن نے بچوں کے ادب میں منفرد مقام بنا لیا ہے۔ سائنس فکشن جہاں

بچوں کو جدید سائنسی معلومات فراہم کرتا ہے وہیں انہیں خلائی مہمات، فضائی سیر و سیاحت اور اس نوع کے دلچسپ موضوعات پر تازہ بہ تازہ معلومات بھی فراہم کرتا ہے۔ تخیلاتی اڑن کھٹولہ اب پرانی چیز ہو گئی ہے۔ بچے خود ہوائی جہاز میں بیٹھ کر آسمان کی سیر کرتے ہیں۔ انسان خلا میں جاکر اپنی ہی دنیا کو چھوٹے سے سیارے کی شکل میں دیکھتا ہے۔

کرشن چندر نے ناول "ستاروں کی سیر" میں بچوں کو نئے نئے جہانوں کی گھر بیٹھے سیر کرائی ہے۔ اس ناول میں تحیر و استعجاب سے تخیلات و حادثات کا ایک طویل سلسلہ پھیلا ہوا ہے اور تفریح کے پردے میں بچوں کو جدید سائنسی ایجادات اور کائنات کے اسرار سے روشناس کرایا ہے۔

اس ناول میں ایک روبوٹ سائنس داں کے احکامات کا پابند ہے، اونچے اونچے پہاڑوں پر ایٹمی قلعہ بندیاں کی جا چکی ہیں۔ دنیا دو گروہوں میں بٹ چکی ہے۔ ایک سائنسدانوں کی دنیا دوسری عام انسانوں کی دنیا۔ سائنس داں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے ہیں۔ ان سائنس دانوں میں ایک بوڑھا سائنس دان، تین بچوں، عرفی، ناز اور موہنی کے ساتھ پہاڑ کی سب سے بلند چوٹی پر رہتا ہے۔ اس کا چوتھا سائنسی بیٹا جمی روبوٹ ہے۔ جمی کے ہاتھ، پاؤں، ناک کان حتی کہ بال تک ہیں۔ اس کے پاس دماغ بھی ہے۔ سائنسداں نے چاند پر پہنچنے کے لئے ایک راکٹ تیار کیا۔ جس کو صرف جمی ہی چلا سکتا ہے۔ ایک دن اچانک بچے روبوٹ کے ساتھ پروفیسر کے تیار کردہ راکٹ کو اسٹارٹ کر لیتے ہیں اور خلا میں پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں انہیں عجیب و غریب کائنات دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ کائنات مافوق الفطرت واقعات، پریوں اور دیو کی دنیا اور پرستان جیسی قدیمی داستانی دنیاؤں سے قطعی مختلف ہے۔ تخیلا ی اور سائنسی انکشافات کی آمیزش سے مصنف نے ایسی پر اسرار اور عجیب و غریب فضا تخلیق کی ہے کہ اس کے سامنے طلسمی دنیا ہیچ نظر آتی ہے۔

ناول "ستاروں کی سیر" تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب کا آغاز روبوٹ 'جمی' کے تعارف سے ہوتا ہے۔ سائنس داں نے یہ روبوٹ آٹھ برس میں تیار کیا ہے۔ اس کو باقاعدہ تربیت دی گئی ہے۔ بچے اس کی مدد سے ہی راکٹ کو خلا میں لے جاتے ہیں۔

ناول کا پلاٹ نہایت عمدگی اور خوش سلیقگی سے مرتب کیا گیا ہے۔ خلا کے باشندے، ستاروں کی سیر، عجیب و غریب دلچسپ واقعات، سائنسی کرشمے۔۔۔ غرضیکہ بچوں کی دلچسپی، تفریح طبع کے ساتھ ان کو سائنسی معلومات اور جدید ترقیات سے نہایت خوبصورت پیرایہ میں متعارف کرایا گیا ہے۔ جہاں تخریب کار سائنس داں اور امن پسند بچوں کی پوری داستان افسانوی رنگ میں پیش کی گئی ہے۔

***

یہ آج سے پچاس برس آگے کی کہانی ہے۔ جب ایٹمی بموں اور راکٹوں کی جنگ سے دنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی ختم ہو چکی تھی۔ زمین کا محور بدل گیا تھا۔ زمین کی سطح نیچی ہو گئی تھی۔ اور سمندر کی سطح اوپر ہو گئی تھی۔ جس سے سمندر کا پانی زمین پر چڑھ آیا تھا، اور دنیا کا تین چوتھائی حصہ سمندر میں غرق ہو گیا تھا ان دنوں انسانی آبادی پہاڑی علاقوں میں رہنے لگی تھی۔ ان دنوں سال میں صرف دو موسم ہوتے تھے، گرمی کا موسم اور سردی کا موسم۔ گرمی کا موسم نو مہینے کا ہوتا تھا اور سردی کا موسم تین مہینے کا۔ اور گرمی بھی اس قدر تیز ہوتی تھی اور اس زور کی لُو چلتی تھی کہ سکول سال میں نو مہینے بند رہتے تھے اور صرف تین مہینے کے لئے کھلتے تھے۔ اس لئے ہر کلاس کے لئے امتحان ہر چار سال بعد ہوتے تھے۔ لڑکے چالیس سال کی عمر میں میٹرک پاس کرتے تھے۔ اور چھپن برس کی عمر میں بی۔اے کی ڈگری حاصل کرتے تھے۔ زمین آج ہی کی طرح سورج کے گرد گھومتی تھی مگر اب ایک دن کے بجائے تین دن میں چکر لگاتی تھی۔ دن آج سے تگنے لمبے اور راتیں بھی تگنی لمبی ہو گئی تھیں۔ شدید گرمی

کی وجہ سے انسان اور جانور دن کو سوتے تھے اور رات کو جاگتے تھے۔ صرف اُلّو اور چمگادڑ دو ایسے جانور تھے، جو اب دن کو کام کرتے تھے اور رات کو سوتے تھے سخت گرمی سے ساری دُنیا کے لوگوں کا رنگ کالا ہو گیا تھا اور سفید آدمی اور سفید ہاتھی کہیں ڈھونڈے سے نہیں ملتا تھا۔ البتہ پرانی کتابوں میں کہیں کہیں سفید آدمی کا ذکر تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس رنگ کا آدمی بھی ایک زمانے میں اس دنیا میں پایا جاتا تھا۔

ان دنوں پاکستان کا دارالخلافہ ایبٹ آباد ہو گیا تھا اور ہندوستان کا الموڑہ اور ریڈیو سیلون کی آواز کہیں سنائی نہ دیتی تھی۔ کیوں کہ سیلون کا پورا جزیرہ پانی میں غرق ہو چکا تھا۔ اور لنکا کے باسی ہجرت کر کے کیرالا اور کورگ کی پہاڑیوں میں آباد ہو گئے تھے۔ اور اب اپنی سنہالی زبان کے بسانے کا حق مانگتے تھے۔

یہی حال برطانیہ کے جزیروں کا ہوا۔ صرف سکاٹ لینڈ کے چند اونچے پہاڑوں میں چند ہزار انگریز زندہ تھے اور بڑی مشکل سے بھیڑیں چرا کر اپنا پیٹ پالتے تھے۔ جاپان بھی پانی میں غرق ہو گیا تھا صرف کوہ فیوجی یاما کے گرد و نواح میں چند سو جاپانی پائے جاتے تھے۔ کشمیر کا مسئلہ بڑی خوبی سے حل ہو گیا تھا۔ اب کشمیر میں جتنی ناریل کے درختوں کی کاشت کرتے تھے۔ اور سوئٹزرلینڈ میں عرب کھجوریں اگاتے تھے۔ اور تیل کے چشمے جن کی وجہ سے آخری ایٹمی جنگ لڑی گئی تھی سمندر کی تہ میں تھے۔ اب ساری دُنیا کی آبادی دو ارب سے گھٹ کر ڈیڑھ کروڑ رہ گئی تھی۔ اور اب ساری دُنیا کی ایک زبان تھی۔ پہاڑی! اور ساری دُنیا کے لوگ ایک ہی راگ گاتے تھے۔ پہاڑی!! اور ان سب لوگوں کی ایک

ہی قوم تھی۔ پہاڑی!!!

ہندوستان اور پاکستان کا بیشتر حصّہ تہ آب تھا صرف ان ہی جگہوں پر انسانی آبادی تھی جہاں پہاڑ تھے اور سطح زمین سمندر سے بلند تھی۔ چنانچہ بمبئی پانی میں غرق تھا اور کراچی کا کہیں پتا نہ چلتا تھا۔ البتہ کہیں کہیں سمندر میں مچھلیاں پکڑنے والے ماہی گیر جب ان جگہوں پر جال ڈالتے تو مچھلیوں کے بجائے ایسی لانبی اور خوب صورت موٹریں ان کے ہاتھ آتیں جن سے پتا چلتا تھا کہ کبھی یہاں وزیر رہتے تھے۔ جہاں پر اب لاہور ہے وہاں پر وھیل مچھلی پائی جاتی تھی۔ اور کراچی میں امریکی شارک مچھلی بھی کثرت سے ملتی تھی۔ دلی کی وسیع جھیل میں بڑے خطرناک کنکھجورے گھومتے تھے۔ اور خلیج لکھنؤ میں مچھلیاں ترنم سے شعر پڑھتی ہوئی تیرتی تھیں۔ بے چاری بنارس اور علی گڑھ کی یونی ورسٹیاں اپنی مخصوص تہذیبی روایات کو گلے سے لگائے سمندر کے نیچے ـــــ میلوں نیچے غرق تھیں۔ انجمن ترقی اردو کے گھر میں ایک مگرمچھ رہتا تھا۔ اور آل انڈیا ہندی ساہتیہ سمیلن سمندری سانپوں کا مسکن تھا۔ اور ان سب کے اوپر سمندر ہنستا تھا۔

گو دنیا کی آبادی گھٹتے گھٹتے ڈیڑھ کروڑ ہو چکی تھی، لیکن لڑائی ابھی تک جاری تھی۔ اونچے اونچے پہاڑوں پر ایٹمی قلعہ بندیاں تھیں، جہاں سے ہزاروں میل تک مار کرنے والے راکٹ بم پھینکے جاتے تھے۔ دنیا دو گروہوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ایک گروہ کہتا تھا: "میں لوں گا۔" دوسرا گروہ کہتا تھا: "میں نہیں دوں گا۔" ـــــ تیسرے گروہ میں صرف ایک آدمی تھا۔

اس کا عقیدہ تھا: "میں جیوں گا۔" لیکن لوگ اُس کی بات نہیں سنتے تھے۔ اور اپنی لڑائی لڑے جاتے تھے۔

یہ تیسرا آدمی ایک بڈھا پروفیسر تھا، اور اپنے زمانے کا مشہور سائنس داں تھا۔ لیکن اپنے عقیدے کی وجہ سے یونی درسٹی سے نکال دیا گیا تھا۔ اب وہ ہمالیہ کے پہاڑوں میں کینچن جنگا کی چوٹی پر سب سے الگ خاموش زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کے چار بچے تھے۔ سب سے بڑے لڑکے کی عمر سترہ برس کی تھی۔ اس کا نام عُرفی تھا۔ اس سے چھوٹی چودہ برس کی لڑکی تھی، جس کا نام تھا ناز۔ اس سے چھوٹی بارہ برس کی ایک لڑکی تھی۔ جو بے حد پیاری اور شریر تھی۔ اس کا نام تھا موہنی، سب سے چھوٹے لڑکے کی عمر آٹھ سال کی تھی اور اس کا نام تھا جمی۔ لیکن جمی کوئی معمولی لڑکا نہ تھا۔ وہ عام بچوں کی طرح گوشت اور ہڈی کا بنا ہوا نہ تھا۔ وہ تو لوہے کا لڑکا تھا۔ اور اس کی عمر اس لئے آٹھ سال کی تھی کہ اُسے پروفیسر نے بڑی محنت سے فولاد کے ٹکڑے جوڑ جوڑ کر آٹھ سال میں بنایا تھا۔

جمی کے ہاتھ پاؤں آنکھ ناک کان حتیٰ کہ بال تک موجود تھے۔ لیکن وہ سب کے سب لوہے کے بنے ہوئے تھے۔ اس کا دل ایک تھا لیکن دماغ دو تھے۔ تاکہ اگر ایک دماغ کام نہ کرے تو دوسرا چالو ہو جائے۔ اسی طرح اس کے دو معدے تھے۔ ایک معدے میں ہمیشہ خوراک بھری رہتی تھی۔ کیوں کہ جمی سارے کا سارا لوہے کا بنا ہوا تھا اس لئے اُسے بھوک بہت لگتی تھی۔ جمی بجلی کی مدد سے چلتا تھا، بالکل اسی طرح جیسے

عام بچے چلتے ہیں، ہنستا تھا، کھیلتا تھا۔ گیت گاتا تھا۔ سکول جاتا تھا۔ اور اسکول کے بچوں کی طرح استاد سے مار بھی کھاتا تھا۔ مگر اس مار کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ کیوں کہ وہ تو لوہے کا بنا ہوا تھا۔ سکول کے لڑکے تو کیا بڑے بڑے آدمی اس سے لڑتے ہوئے ڈرتے تھے۔ کیوں کہ جمی فولاد کا بنا ہوا تھا۔ جمی بڑا ڈھیٹ بھی تھا۔ کیوں کہ اس پر سردی گرمی کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ پروفیسر نے جمی کے دماغ میں بجلی کا ایک چھوٹا سا ڈائنمو لگا دیا تھا۔ یہ ڈائنمو سو سال تک چلنے والا تھا۔ اس اعتبار سے جمی کی عمر کم سے کم سو سال کی ہوگی۔ سو سال کے بعد پھر نیا ڈائنمو اور جمی پھر سو سال کے لئے تیار! اس پر زکام، کھانسی، ملیریا، انفلوئنزا، ہیضہ کسی بیماری کا اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ کیوں کہ وہ تو لوہے کا بنا ہوا لڑکا تھا۔

جمی کی آنکھوں میں ٹیلی ویژن کی پتلیاں تھیں، اور وہ ان کی مدد سے کئی سو میل تک دیکھ سکتا تھا۔ اس کے کانوں میں راڈر تھا۔ جس سے وہ کئی ہزار میل تک سُن سکتا تھا۔ پروفیسر، جمی کو بہت چاہتا تھا۔ جمی ابھی آٹھ ہی سال کا تھا۔ لیکن اسی عمر میں پروفیسر نے اس کے دماغوں میں سائنس، ریاضی، ادب، شعر و فلسفہ، سماج اور معاشرے کا اتنا علم بھر دیا تھا کہ وہ بڑے سے بڑے پروفیسر کو پڑھا سکتا تھا۔ اور اتنا طاقت ور تھا کہ بڑے سے بڑے پہلوان کو گرا سکتا تھا۔ اور اُسی قدر نیک دل بھی، ہر ایک سے پیار کرتا تھا۔ پروفیسر جمی کا دل ایسا خوب صورت اور اتنا اچھا بنا دیا تھا کہ اس میں نیک خیالوں کے

سوا اور کوئی خیال سما تا ہی نہ تھا۔ (رجمی ایک بہت ہی اچھا لوہے کا لڑکا تھا!)

پروفیسر نے کن جن چنگا پہاڑ کی چوٹی پر اپنے گھر سے دو میل دُور ایک لیبارٹری قائم کر رکھی تھی جہاں وہ دن رات کام کرتا رہتا تھا۔ برسوں سے وہ ایک ایسا جہاز بنانے میں لگا ہوا تھا جو اُڑ کر چاند تک پہنچ سکے۔ جس میں وہ اپنے بچوں سمیت اُڑ کر چاند تک پہنچ سکے۔ یہ جہاز اب قریب قریب مکمل ہو چکا تھا۔ اس پر دن رات کام ہوتا تھا اور جب پروفیسر کے لڑکے لڑکیاں سکول سے فارغ ہو کر گھر آتے تو وہ لوگ بھی لیبارٹری پہنچ جاتے اور اپنے باپ کی مدد کرتے۔ موہنی بہت شریر تھی۔ وہ اکثر اپنے باپ سے پوچھتی "پاپا چاند میں جاکر کیا کروگے؟"

"ہاں پاپا۔ ناز بولتی "چاند میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ہماری سائنس کی کتابوں میں لکھا ہے کہ چاند میں ہوا اور پانی بھی نہیں ہے۔ دن رات ریت کے بگولے اُٹھتے ہیں اور بڑے بڑے آتش فشاں پہاڑ خاموش کھڑے رہتے ہیں۔ ایسی خوفناک جگہ جاکر ہم کیا کریں گے؟"

پروفیسر سمجھاتے ہوئے کہتا "بیٹی۔ ہماری دوربینوں سے زمین اور چاند کا صرف ایک حصہ نظر آتا ہے۔ اور زمین اور چاند کی گردش کا یہ حساب ہے کہ ہمیشہ وہی حصہ نظر آتا ہے جو ویران اور بنجر ہے۔ جہاں نہ ہوا ہے نہ پانی، نہ درخت ہیں۔ نہ جانور۔ لیکن چاند کا وہ حصہ

جو ہماری دوربین کی آنکھ سے اوجھل ہے اس میں کیا ہے؟ یہ آج تک کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ بیٹی، میں چاند کو دوسری طرف سے بھی دیکھنا چاہتا ہوں"

"وہاں کیا ہوگا؟"

"ابھی کیسے بتا سکتا ہوں؟" پروفیسر نے جواب دیا۔

"ہاں جو چیزیں وہاں ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔ وہ اگر مجھے مل گئیں تو پھر مجھ سے بڑا خوش قسمت انسان کوئی نہ ہوگا۔"

"وہ کیا چیز ہے پاپا؟" موہنی پروفیسر کی ڈاڑھی سے کھیلتی ہوئی پوچھتی۔

پروفیسر کہتا "جب یہ جہاز تیار ہو جائے گا تو پھر بتاؤں گا۔"

"یہ جہاز کب تیار ہوگا؟" موہنی نے پھر پوچھا۔

پروفیسر نے جمی سے پوچھا "تم بتاؤ بیٹے!"

جمی نے فوراً جواب دیا "ابھی اس میں دس دن کا کام باقی ہے اور جب یہ جہاز تیار ہو جائے گا تو اس کی لمبائی ۶۰ میٹر ہوگی، چوڑائی چھ میٹر، وزن ایک ہزار ٹن۔ اس میں چار راکٹ پمپ ہوں گے جو پارے کی بھاپ سے چلیں گے!"

"شاباش!" پروفیسر نے جمی کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے اپنے سب سے بڑے لڑکے عرفی سے کہا "دیکھا تم نے میرا سب سے چھوٹا بیٹا تم سب سے زیادہ ہوشیار ہے۔"

عرفی نے جھینپ کر کہا "لوہے کا دماغ جو پایا ہے۔"

موہنی نے زبان نکال کر جمی کو چڑاتے ہوئے کہا "جو! جو! جو! بڑے آئے لائق کہیں کے!"

جمی غصے میں آکے موہنی کے پیچھے بھاگا تو پروفیسر نے روک کر کہا۔ "اپنی بہن سے لڑے گا!"

جمی روہانسا ہو کے بولا "تو پھر یہ مجھے چھیڑتی کیوں ہے؟" "اگر میں ان سب سے زیادہ لائق ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

اچھا جاؤ، جاؤ۔ پروفیسر نے سب بچوں کو لیبارٹری سے باہر نکالتے ہوئے کہا "جاؤ مجھے کام کرنے دو!"

نویں دن جہاز بالکل تیار ہو گیا۔ بہت خوب صورت تیر کی طرح نوکیلا اور چمکتا ہوا۔ رات کو پروفیسر نے اپنے بچوں کی مدد سے اس کے انجن چلا کے دیکھے۔ پوری مشینری کا معائنہ کیا۔ بچے ہر طرح سے مدد کر رہے تھے، کیوں کہ وہ بھی آخر ایک سائنس داں کے بچے تھے۔ اور پروفیسر نے انھیں ہر طرح سے سائنس کے مختلف شعبوں میں لائق بنانے کی کوشش کی تھی۔ عرفی سب سے بڑا لڑکا تھا اور ہر بات میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ مگر جہاں کوئی مشکل آپڑتی تھی تو جمی ہی سب کی مدد کو آتا تھا کیوں کہ اس کا دماغ لوہے کا تھا اور بجلی کی مدد سے چلتا تھا۔ اور اس قدر تیز چلتا تھا کہ جو بات کسی دوسرے کو دس گھنٹے کے بعد سوجھتی اُسے ایک منٹ میں سوجھ جاتی۔ رات کو سب کام ختم کر کے مشینری فٹ کر کے، کھانے کا سامان جہاز میں رکھ کر کوئی بارہ بجے کے قریب گھر

لوٹے۔ پروگرام یہ تھا کہ صبح سویرے جہاز میں بیٹھ لیا جائے۔ چوں کہ یہ پہلا جہاز تھا، جو ہماری زمین سے اڑکر چاند کو جا رہا تھا۔ اس لئے بچے ایک نئی دنیا کو دیکھنے کے تصور میں مگن اور مسرور تھے۔ پروفیسر بھی بہت خوش نظر آتا تھا۔ وہ اس دنیا کا پہلا انسان تھا جو اڑ کر چاند میں جا رہا تھا۔ لیکن رات کو جب پروفیسر اپنے بچوں کے ہمراہ گھر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ پولیس اس کے دروازے پر کھڑی ہے۔ وہ لوگ اسے گرفتار کرنے آئے تھے۔ کیونکہ ساری دنیا میں وہی ایک شخص تھا جو "میں لوں گا۔" کے فلسفے میں ایمان رکھتا تھا "میں نہیں دوں گا۔" والوں میں سے تھا۔

"اچھا تو تم "میں جیوں گا" والی باتوں میں یقین رکھتے ہو؟" پولیس والوں نے اس سے پوچھا۔

"جی ہاں"

"اور آج تک تم نے کسی طرف سے بھی کسی لڑائی میں حصہ نہیں لیا۔"

"نہیں"

"تم بہت خطرناک آدمی معلوم ہوتے ہو۔ گورنمنٹ تمہیں گرفتار کرکے ماؤنٹ ایورسٹ کی جیل میں بھیج رہی ہے۔ جہاں تم زندگی بھر نظر بند رہو گے"

"اور میرے چھوٹے چھوٹے بچے؟"

"گورنمنٹ کسی طرح کسی کے لئے ذمہ دار نہیں ہے۔ ہاں اور سنا گیا ہے کہ تم چاند میں اُڑ کر جانے کی کوشش کر رہے ہو۔ یہ حرکت بھی خلافِ قانون ہے۔ ہماری گورنمنٹ کے سائنس داں کل صبح آئیں گے اور تمھاری لیبارٹری کو تباہ کر دیں گے۔ لو یہ ہتھکڑی پہن لو۔"

پروفیسر نے کہا: "اگر آپ اجازت دیں تو میں دس منٹ میں اپنے بچوں سے رخصت ہو لوں۔"

"ضرور ضرور۔" پولیس انسپکٹر بولا۔

پروفیسر اپنے بچوں کو جمی سمیت ایک الگ کمرے میں لے گیا اور ان سے کہنے لگا: "جس بات کا مجھے خطرہ تھا، آخر وہ ہو کے رہی۔ میری برسوں کی محنت بے کار جا رہی ہے۔ وہ لوگ مجھے گرفتار کر کے میرے جہاز کو تباہ کر دیں گے۔ اس کرہ ارض پر انسان کے زندہ رہنے کی آخری امید بھی مٹ جائے گی۔"

"وہ کیسے پاپا؟" عرفی نے بہت سنجیدہ ہو کر پوچھا۔ پروفیسر نے اپنے بڑے بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا: "بیٹا میں تم سے عمر میں بہت بڑا ہوں۔ میں نے وہ زمانہ دیکھا ہے جب انسان اس دنیا کے ہر گوشے میں آباد تھا۔ جہاں آج سمندر ہے وہاں شہر بستے تھے۔ گاؤں پھولوں کی طرح کھلے ہوئے تھے۔ وہاں پر باغ تھے اور کھیتیاں اور کارخانے مگر انسانوں نے لڑ لڑ کر اپنے آپ کو تباہ کر لیا ہے۔ اب اس زمین کے صرف پہاڑی علاقے سمندر کی سطح سے اوپر ہیں

اگر ہماری ایٹمی اور راکٹی لڑائیاں اسی طرح جاری رہیں تو زمین کا محور اور بدلے گا۔ زمین کی سطح اور نیچی ہو گی۔ اور اگلے پانچ سال میں ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی بھی پانی میں غرق ہو جائے گی۔ پھر کوئی انسان زندہ نہ بچے گا۔"

عرفی نے کہا، "مگر ہم تو بچے ہیں پاپا۔ ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

پروفیسر بولا: "بچے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ جب بڑوں کے دل میں سودا سما جائے تو بچے ہی اپنی نیک دلی سے اور معصوم عقل سے انہیں صحیح راستے پر لا سکتے ہیں۔"

"وہ کیسے؟" ناز بولی۔

پروفیسر نے کہا: "تمہیں معلوم ہے میں چاند میں کیوں جا رہا تھا؟ اب تک وہ راز میں نے کسی کو نہیں بتایا ہے۔ آج میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ میرے بچو! ایک زمانے میں یہ دنیا ایسی نہ تھی۔ لوگ اس طرح لڑتے جھگڑتے نہیں تھے۔ اپنے اپنے گھروں میں، گاؤں میں، قصبوں میں بڑے آرام اور سکون سے رہتے تھے۔ اس زمانے میں ہماری دنیا میں ایک چڑیا رہتی تھی۔ جو ہر وقت امن اور چین کے گیت گاتی تھی۔ صرف ایک ہی ایسی چڑیا تھی ہماری دنیا میں۔ لیکن وہ ہمارے جھگڑوں سے تنگ آ کے چاند کی دنیا میں چلی گئی ہے۔ اور جب سے وہ گئی ہے یہ لڑائی جھگڑے برابر جاری ہیں اور ایک منٹ کے لئے بند نہیں ہوئے۔ اور جب تک یہ چڑیا اس دنیا میں واپس نہ آئے گی،

یہ دنیا اسی طرح تباہ و برباد ہوتی رہے گی "۔

" تو پاپا کیا تم اسی چڑیا کو لانے کے لئے چاند میں جا رہے تھے ؟ " موہنی نے پوچھا۔

" ہاں بیٹی "

" اس چڑیا کی پہچان کیا ہے ؟ " نازنے پوچھا۔

پروفیسر نے کہا " وہ ایک سفید رنگ کی کبوتری ہے۔ اور اس کے سر پر کنول کے پھولوں کا تاج ہے اور ـــــــ "

پروفیسر ابھی اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ یکایک پولیس والوں نے اندر آکے کہا۔ " چلو، چلو۔ بہت وقت ہو گیا۔ ایسے تو تم زندگی بھر اپنے بچوں سے رخصت نہ ہو گے "۔

پولیس والے بڈھے پروفیسر کو گرفتار کر کے لے گئے۔ سب بچے رونے لگے۔ جمّی کو بھی رونا آگیا۔ وہ اس قدر مضبوط تھا کہ اگر چاہتا تو سب پولیس والوں کو مار کے پروفیسر کو چھڑا سکتا تھا۔ مگر پروفیسر نے اسے منع کر دیا تھا۔ اس لئے جمّی چپ چاپ اپنی جگہ پر کھڑا روتا رہا۔ اور پولیس والے پروفیسر کو گرفتار کر کے لے گئے۔

جب پولیس والے چلے گئے تو عرفی نے سوچ سوچ کے باقی بچوں سے کہا " کیا رلانے ہے ؟ ہم لوگ چاند میں چلیں اور چل کے اس چڑیا کو لے آئیں "۔

" ہم بچے چاند میں جائیں گے ؟ پاپا کے بغیر ؟ ـــــ "

موہنی نے ڈر کے پوچھا "نہ بھیا میں تو نہ جاؤں گی!"

ناز بولی "میں تو چلوں گی تمھارے ساتھ۔"

جمی بولا "میں بھی چلوں گا۔"

موہنی بولی "مگر ہم لوگ اتنا بڑا جہاز کیسے چلائیں گے؟"

عرفی نے کہا "میں جمی کی مدد سے چلا لوں گا۔ کیوں جمی؟"

"ٹھیک ہے!" جمی بولا "تو ابھی چلو۔ صبح کو جہاز تباہ کرنے والے آجائیں گے۔"

چاروں بچے رات کو اندھیرے میں چھپتے چھپاتے لیبارٹری کے باہر کھڑے ہوئے راکٹ جہاز کے قریب پہنچے۔ راکٹ جہاز چھپے سو فیٹ اونچے زینے سے لگا تیر کی طرح آسمان کی طرف رخ کئے کھڑا تھا۔ بجلی کی لفٹ سے چند منٹ میں وہ لوگ جہاز کے اندر پہنچے۔ عرفی نے کپتان کا کام سنبھال لیا۔ ناز ٹیلی ویژن اور راڈر کی مشینوں پر بیٹھ گئی۔ جمی راکٹ پمپوں پر چلا گیا۔ موہنی کو باورچن کا کام سونپا گیا۔ کیوں کہ وہ بہت شریر تھی اور اسے کچھ آتا ہی نہیں تھا۔ عرفی نے ہیڈ فون لگا کے پوچھا "ریکٹر (REACTOR) ریڈی؟"

"ریڈی"۔ جمی بولا۔

"ریکٹر مکس ریڈی؟"

ناز نے جواب دیا، "ریڈی۔"

شریر موہنی خود بخود بول اٹھی "سینڈوچ بھی ریڈی!"

عرفی نے اُسے ڈانٹ دیا۔ پھر بولا "ریکیٹ اکس ٹو فلائی!"

"شپ ماسٹر ٹو فلائی!"

"ریڈی جمی۔ سٹارٹ فرسٹ پمپ!"

جمی نے ہینڈل گھما کے پہلا پمپ کھولا۔ آگ شعلے اور بھاپ کے طوفان میں راکٹ جہاز زینے سے الگ ہوکر آسمان کی طرف پرواز کرنے لگا۔

سیکنڈ پمپ سٹارٹ!

تھرڈ پمپ سٹارٹ!!

فورتھ پمپ سٹارٹ!!!

چوتھے پمپ کے کھولنے تک راکٹ جہاز زمین کی کشش ثقل سے آزاد ہو چکا تھا، اور اوپر کی فضا میں اُڑ رہا تھا۔ یہاں سے زمین ایک چھوٹی سی گیند تھی۔ آسمان کا رنگ کالا تھا، اور دور دور تک فضا میں ستارے، روشن ہنڈولوں کی طرح جھول رہے تھے اور بچوں کا جہاز چاند کی طرف اُڑا جا رہا تھا۔

بچوں کا جہاز ایک گھنٹے میں تیس ہزار میل کی رفتار سے اڑا جا رہا تھا۔ زمین کی کشش ختم ہو چکی تھی۔ مگر جہاز کی جس کیبن میں بچے بیٹھے تھے۔ وہ ایک گولے کی طرح اپنے محور پر خود ہی گھومتی تھی۔ اس سے جہاز میں نقلی کشش پیدا ہو گئی تھی، اور جہاز کے اندر بیٹھے ہوئے بچے یہی محسوس کرتے تھے۔ جیسے وہ زمین پر اپنے گھر میں

بیٹھے ہوں۔ ان کا وزن بھی وہی تھا جو زمین پر ہوتا ہے۔ اس لئے وہ جہاز کے اندر مقناطیسی جوتوں کی مدد کے بغیر چل پھر سکتے تھے۔ حالاں کہ اس سے پہلے کے جہازوں میں یہ بڑی مصیبت تھی کہ جوں ہی زمین کی کشش سے آزاد ہوتے تو جہاز چلانے والوں کا وزن ایک دم کم ہو جاتا تھا، اور وہ فضا میں اڑنے لگتے تھے اور جہاز کے اندر ایک مشین سے دوسری مشین تک جانے کے لئے انھیں مقناطیسی جوتے پہننے پڑتے تھے۔

راستے میں بچوں نے بہت سے جہاز ایسے دیکھے جو چاند تک پہنچ نہ پائے تھے کہ بگڑ گئے اور اب خلا میں چکر لگا رہے تھے۔ زمین جو پہلے ایک (گول) گیند کی طرح نظر آتی تھی اب اور بھی چھوٹی نظر آنے لگی۔

یکایک جمی نے چلا کر عرفی سے کہا "جہاز کا رُخ ۳۸ ڈگری مغرب کو کر دو۔"

عرفی نے پوچھا۔ "کیوں؟"

"مشرق سے ایک دُم دار ستارہ آ رہا ہے کہیں ٹکر نہ ہو جائے۔"

"مجھے تو کہیں نظر نہیں آتا" عرفی بولا۔

جمی نے چڑ کر کہا "تمھیں کیسے نظر آئے گا۔ راڈر بتا رہا ہے جلدی کرو۔"

شریر موہنی تالی بجا کر بولی "نہیں بھیا، رہنے دو، میں دُم دار ستارہ دیکھوں گی۔ کیا اس کی دُم بہت لمبی ہوتی ہے۔ جمی بھیا؟"

"ہاں!"

"کتّے کی دُم سے بھی لمبی؟"

" لنگور کی دُم سے بھی لمبی؟ آہا جی" موہنی تالی بجاتے ہوئے بولی "میں دُم دار ستارے کی دُم میں پٹاخے باندھ دوں گی اور پھر آگ لگا کر تماشا دیکھوں گی"

" اری پگلی" جمی بولا " دُم دار ستارے کی دُم کئی ہزار میل لمبی ہوتی ہے۔ اس دُم میں تمہاری زمین جیسے کئی پٹاخے باندھے جا سکتے ہیں۔ ہمارا جہاز اگر اس کی دُم کے کہیں قریب سے بھی ہو کر گزرا تو خیریت نہیں" جلدی کرو۔ جہاز کا رُخ مغرب کی طرف موڑ دو"

عرفی نے کہا "مگر رُخ موڑ دینے سے چاند اور دُور ہو جائے گا"

جمی نے جلدی سے آ کے خود جہاز کا رُخ تیزی سے پلٹ دیا "اس وقت دُم دار ستارے سے اپنی جان بچاؤ۔ چاند بعد میں دیکھا جائے گا"

بڑی مشکل سے اس نے جہاز کا رُخ موڑا ہی تھا کہ سیاہ آسمان اس طرح روشن ہو گیا جیسے لاکھوں ستارے پھلجھڑیوں کی طرح چھوٹتے چلے گئے ہوں۔ رنگا رنگ شہاب ثاقب جہاز کے دائیں بائیں چلے گئے انار، پھلجھڑیاں، ہوائیاں اور لال پیلی نیلی نارنجی اودی چکریاں آسمان میں چکر لگا رہی تھیں۔

جمی جہاز کو موڑ کر مغرب کی طرف لے جا رہا تھا۔ ان آتش بازوں سے بہت دُور۔

"یہ تم نے کیا کہا؟" ناز زرا خفا ہو کے بولی "اتنا اچھا لگ رہا تھا آسمان بالکل دیوالی کی طرح، ہائے اللہ کیسی خوب صورت چکریاں تھیں۔"

جمی نے کہا "اگر ان میں سے ایک چکری بھی ہمارے جہاز کو چھو لیتی تو ہم بھی زندگی بھر فضا ہی میں چکر لگاتے رہتے اور چاند تک کبھی نہ پہنچ سکتے۔"

عرفی نے کہا "بڑی مشکل سے دم دار ستارے کی دُم سے بچے ہیں۔"

جمی نے کہا "اس کم بخت کی دُم کا تو کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اگر کبھی ہماری زمین سے ٹکرا جائے تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔"

ناز نے کہا "مگر شکر یہی ہے کہ یہ دُم ہمیشہ ہم سے دُور ہی رہتی ہے۔"

عرفی نے کہا "مجھے تو بھوک لگی ہے۔"

موہنی بولی "مجھے بھی۔"

ناز نے کہا "موہنی باورچی خانے کی مالکن تم ہو۔ تم ہی سب کو کھلاؤ ہم لوگ اپنی اپنی مشینوں سے اُٹھ نہیں سکتے۔"

موہنی نے ناز اور عرفی کو سینڈوچ بنا کے دیئے۔ اور خود بھی کھانے لگی۔ جمی تو پیٹرول پیتا تھا۔ اور گریز (GREASE) کھاتا تھا۔ اس لئے موہنی نے یہ دونوں چیزیں الگ رکھ دیں۔

"اونہہ!" عرفی نے سینڈوچ کھاتے ہوئے کہا۔ "موہنی تم نے سینڈوچ بہت اچھے بنائے ہیں!"

جمی نے پیٹرول کی بوتل منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔ "پیٹرول بھی بہت عمدہ ہے۔ اس کی مہک بھی بہت اچھی ہے۔ کہاں سے لیا تم نے؟

کا لٹکس کیسی ہے ؟"

"نہیں تو" موہنی بولی "یہ تو جوالا مکھی پہاڑ کا پیٹرول ہے۔"

یکایک جمی پیٹرول پیتے پیتے رک گیا۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"کیا بات ہے جمی!" ناز گھبرا کے بولی۔

مگر جمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا اور بے جان تھا۔

"جمی! جمی!!" عرفی زور سے چلایا۔ وہ اپنی مشین سے ہٹ کر جمی کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ رک گیا۔ کیوں کہ جہاز کے بالکل ہی سامنے نیلے رنگ کی کرنوں کا اک طوفان بڑھا چلا آ رہا تھا۔ عرفی نے جہاز کا رُخ بدلنے کی بہت کوشش کی۔ مگر نیلی شعاعوں کی لہروں نے پہلے ہی جہاز کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا، اور اب جہاز ان نیلی شعاعوں میں اس طرح گھوم رہا تھا جس طرح گہرے پانی کے کسی بڑے بھنور میں کوئی کشتی پھنس کر چکر کھانے لگے۔

عرفی اپنی پوری طاقت سے جہاز کو اس نیلے بھنور سے نکالنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن جیسے جیسے وہ کوشش کرتا جہاز اور بھی بھنور کے اندر پھنستا جاتا۔

یکایک موہنی زور زور سے ہنسنے لگی۔

"چپ رہ" ناز بگڑ کر بولی "یہاں جان پر بنی ہے اور یہ کھڑی ہنس رہی ہے۔"

مگر موہنی ہنستی ہی چلی گئی۔ اسے ہنستے دیکھ کر چند لمحوں کے بعد خود

ناز کو بھی ہنسی آنے لگی۔ یکایک عرفی کی سمجھ میں آیا کہ یہ ہنسی قدرتی نہ تھی۔ یہ ہنسی شاید نیلی شعاعوں کے اثر کا نتیجہ تھی۔ عرفی نے فوراً ایک بٹن دبایا اور بٹن دباتے ہی جہاز کے چاروں طرف سفید رنگ کا خول چڑھ گیا۔ یہ سفید رنگ کا خول کئی دھاتوں کا مرکب معلوم ہوتا تھا۔ اس خول کے چڑھتے ہی نیلی شعاعوں کی روشنی جہاز کے اندر آنا بند ہو گئی اور جہاز کے اندر اندھیرا چھا گیا۔ عرفی نے دوسرا بٹن دبا کر بجلی کی روشنی کی۔ اور پھر اس نے دیکھا کہ جمی کا منہ جو پہلے لٹکا ہوا تھا اب اپنی جگہ پر ہے۔ مگر اس کی آنکھوں میں روشنی نہیں ہے۔ عرفی جلدی سے اٹھ کر جمی کے پاس آیا۔ اس نے پیچ کش سے جمی کا سر کھولا۔ معلوم ہوا کہ ڈائنمابند تھا۔ یہ بھی شاید نیلی شعاعوں کا اثر تھا۔ عرفی نے جلدی سے بجلی لگا کر ڈائنما کو ٹھیک کیا۔ اور جمی پھر کام کرنے لگا۔

عرفی نے پوچھا "کیا ہوا تھا تمھیں؟"

"کب؟ کس وقت؟" جمی نے حیرت سے پوچھا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے!" موہنی گھبرا کر بولی۔

"نہ تم بولتے تھے نہ کسی بات کا جواب دیتے تھے اور تمھارا منہ کھلے کا کھلا تھا"

"اور تم بھی تو بے تحاشا ہنس رہی تھیں"۔ ناز نے جمی کی طرف داری کرتے ہوئے طعنہ دیا۔

جمی بولا "شاید یہ نیلی شعاعوں کا اثر تھا مجھے تو بس ایسا معلوم ہوا

جیسے یکایک کسی نے میرے سر پر ہتھوڑا مارا۔ پھر مجھے کچھ یاد نہ رہا۔ دراصل ہم سے غلطی ہوئی۔ ہمیں جہاز کے خول کو ہر وقت چڑھا کے سفر کرنا چاہیئے۔ جانے سفر میں کیسی کیسی شعاعوں سے واسطہ پڑے۔ جمی نے ٹیلی ویژن سے دیکھ کر بتایا۔ "ہم ابھی تک نیلی شعاعوں کے طوفان سے گزر رہے ہیں۔ مگر طوفان کا زور شمال کی طرف زیادہ ہے جنوب کی طرف کم ہے۔ تم مغرب سے اب جنوب کی سمت بڑھے چلو۔" جمی نے عرفی کو ہدایت کی۔

"شمال کی طرف نیلا سیارہ گھوم رہا ہے۔"

ناز بولی: "تو ہم نیلے سیارے پر کیوں نہ چلیں۔ چاند میں کیوں جائیں۔"

"نیلے سیارے تک پہنچنے کے لئے ہمیں دس دن کا سفر کرنا پڑے گا، اور ہمارے پاس صرف پانچ دن کی خوراک ہے۔" جمی نے کہا: "اور جس سیارے کی شعاعیں اس قدر تیز ہیں وہاں کے لوگ کیسے ہوں گے۔"

"میرے خیال میں تو ہنس ہنس کر پاگل ہوگئے ہوں گے۔" موہنی بولی۔

عرفی نے کہا: "ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے!"

جمی نے راڈر کے پردے پر دیکھ کر کہا۔

"اب نیلی شعاعوں کا طوفان صرف اگلے چار ہزار میل تک پھیلا ہوا ہے۔ اگلے آٹھ منٹ میں ہم لوگ شعاعوں کے طوفان سے گزر جائیں گے۔"

پھر جمی نے عرفی کی طرف دیکھ کر کہا: "میں تمھاری ہوشیاری کی داد دیتا ہوں تم نے جہاز پر خول چڑھا کے ہم سب کی جان بچالی ورنہ یہ نیلی شعاعیں ہمیں دھکیل کر نیلے سیارے پر لے گئی ہوتیں۔"

جمیؔ گھڑی دیکھتا رہا۔ جوں ہی آٹھ منٹ ختم ہوئے، شعاعوں کا طوفان بھی ختم ہو گیا۔ اگلے دو منٹ میں وہ شعاعوں کے طوفان کو ایک ہزار میل پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اب وہ طوفان نیلی شعاعوں کا ایک بل کھاتا ہوا گچھا معلوم ہوتا تھا۔ نیلی اُون کا گچھا.........

جمیؔ نے عرفی سے کہا "کم سے کم کیبن کی کھڑکیوں سے خول تو ہٹا دو۔ باہر کا نظارہ کریں"۔

عرفی نے ناز سے کہا، ناز نے کیبن کی کھڑکیوں کا پردہ ہٹا دیا تو انہیں اپنے سامنے ایک عجیب و غریب منظر دکھائی دیا۔ سامنے سینکڑوں میل تک پھیلا ہوا ایک شہر تھا، اور یہ شہر پورے کا پورا فضا میں معلّق۔ اس شہر کے نیچے کچھ نہ تھا۔ کوئی زمین نہ تھی۔ شہر کے نیچے آسمان تھا۔ اور شہر کے اوپر بھی آسمان اور بیچ میں یہ شہر معلّق۔

"بھئی یہ کس طرح کا شہر ہے؟" ناز حیرت سے بولی۔

موہنی نے کہا "جہاز ٹھہراؤ۔ ہم یہ شہر دیکھیں گے"۔

مگر جہاز اب اس شہر سے اوپر اڑ کر آگے چلا گیا تھا۔ لڑکیوں کے اصرار پر جہاز کو واپس لایا گیا۔ ریکٹر کو بند کر کے جہاز کی رفتار دھیمی ہوتے ہوتے بالکل رک گئی اور جہاز شہر سے باہر کے ہوائی اڈے پر آکر ٹھہر گیا۔

یہ ہوائی اڈہ بھی بڑا عجیب و غریب تھا۔ اس کی عمارت موتیوں کی بنی ہوئی تھی اور فضا میں سینکڑوں فٹ اوپر اٹھے ہوئے مینار بھی موتی جوڑ جوڑ کر بنائے گئے تھے۔ اور ان میناروں پر سُرخ سُرخ روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔

جیسے ہماری زمین کے ہوائی اڈے پر ہوتی ہیں۔ لیکن اس ہوائی اڈے پر زمین کی طرح سڑکیں نہ تھیں۔ دونوں کناروں پر موتیوں کے داشتے اور بیچ کی جگہ خالی میلوں تک یہی سلسلہ چلا گیا تھا۔ جوں ہی بچوں کا جہاز اس عجیب و غریب ہوائی اڈے پر آکے رُکا، تو ایک تیز رفتار گاڑی جو شکل و صورت میں ہماری موٹروں سے مشابہت رکھتی تھی، جہاز کے قریب آکے رُکی اور اس میں سے ایک لڑکی نکلی۔ جس کا رنگ تانبے کا سا تھا۔ اور جو بعد میں معلوم ہوا کہ صرف تانبے کی بنی ہوئی تھی اور بجلی سے چلتی تھی، تانبے کے رنگ کی لڑکی نے بچوں کے جہاز کا دروازہ کھولا اور کہا: "خوش آمدید! میرا نام تپلی!" اس نے اپنا نام بتایا جواب میں عرفی ناز موہنی اور جمی نے بھی اپنے اپنے نام بتلائے اور تپلی سے ہاتھ ملایا۔

تپلی نے جمی کو دیکھ کر کہا: "یہ بد صورت لڑکا کون ہے؟"

"یہ جمی ہے۔"

عرفی نے کہا۔ یہ لوہے کا بنا ہوا ہے۔"

"تپلی بڑی حقارت سے بولی: "چھی چھی، ہمارے شہر میں تو کوئی بھی لوہے کا بنا ہوا نہیں ہے۔ سب کے سب تانبے کے بنے ہوئے ہیں۔ لوہا تو بڑی بدصورت دھات ہے۔ اس کا رنگ تو دیکھو اور یہ میرا رنگ دیکھو۔"

واقعی تپلی بڑی خوب صورت تھی۔ تانبے کے رنگ کے بال، تانبے کے رنگ کے گال اور تانبے ہی کے رنگ کا سکرٹ اس نے پہن رکھا تھا۔ جب بات کرتی تھی تو ایسی سُریلی گونج پیدا ہوتی تھی جیسے کسی دُھلے دھلائے تانبے

کے برتن کو پانی کی دھار کے نیچے رکھتے وقت پیدا ہوتی ہے۔ جمی تو اُسے دیکھتے ہی عاشق ہو گیا۔ (اسے ؛ ور پھر اسی کے گن گانے لگا)

عرفی نے کہا: "ہم آپ کا شہر دیکھنا چاہتے ہیں"

"شوق سے دیکھئے" تیلی بولی۔

"کیا نام ہے آپ کے شہر کا؟"

"موتی نگر"

اور واقعی یہ شہر موتی نگر تھا۔ یہاں جو عمارت بھی نظر آتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، موتیوں کو جوڑ جوڑ کر بنائی گئی ہے۔ دُودھیا رنگ کی چھے چھے سات سات منزل کی عمارتیں، بے حد حسین اور دل کش، ہر عمارت تاج محل کی طرح خوب صورت نظر آتی تھی (موتیوں کی دیواریں، موتیوں کے لفٹ، کمرے کے اندر موتیوں کا ٹیلی فون، موتیوں کا لباس۔ مگر لوگ تانبے کے تھے۔ مرد تو خیر اتنے اچھے قسم کے تانبے کے نہ تھے مگر عورتیں بہت ہی عمدہ پالش کیے ہوئے تانبے کی تھیں۔

نازنے پوچھا "یہاں گوشت پوست کے انسان نہیں ہوتے؟"

تیلی نے جواب دیا "کسی زمانے میں ہوتے تھے، مگر اب نہیں ہوتے کسی زمانے میں اس شہر پر ان ہی لوگوں کی حکومت تھی۔ اس وقت یہ شہر موتی ستارے پر آباد تھا، جہاں اَن گنت موتی ہوتے ہیں۔ ان ہی لوگوں نے دراصل اس شہر کو آباد کیا اور اس میں بسانے کے لئے تانبے کے آدمی بنائے"

"تانبے کے کیوں، لوہے کے کیوں نہیں؟"

"تانبے کے آدمیوں میں بجلی خوب دوڑتی ہے۔ اور وہ بڑی چستی سے کام

کرتے ہیں۔" تتلی بولی۔" اس کے برعکس لوہے کے آدمیوں کو بڑی جلدی زنگ لگ جاتا ہے اور وہ دیکھنے میں بھی بڑے بدصورت ہوتے ہیں۔ اور موتی ستارے کے انسان بڑے خوش مذاق اور مہذب تھے۔ وہ آسائش پسند بھی تھے۔ آہستہ آہستہ انھوں نے سارا کام مشینوں سے لینا شروع کر دیا۔ مشینوں کے اندر انھوں نے ایسی عقل، یا دانشت اور تجربہ بھر دیا تھا کہ ہر مشین اپنی جگہ پر ایک شخصیت کی مالک ہوتی تھی۔"

"جمی بھیا کی طرح!" موہنی ہنس کر بولی۔

جمی بولا۔" مار بیٹھوں گا!"

تتلی بولی۔" مگر یہ سب کچھ آہستہ آہستہ ہوا۔ آہستہ آہستہ انسان آرام طلب ہونے گئے۔ آہستہ آہستہ مشینوں کو عقل آنے لگی وہ سوچنے لگیں کہ کام تو سب ہم کرتے ہیں، پھر ہم کو انسانوں کی غلامی کی کیا ضرورت ہے، آہستہ آہستہ مشینوں میں بغاوت کا جذبہ ابھرنے لگا۔ تانبے کے آدمیوں میں یوں بھی غصہ بہت ہوتا ہے۔ ہر وقت بجلی کی تیز رو ان کے اندر جو دوڑتی رہتی ہے ایک رات شہر کی ساری مشینوں نے فیصلہ کر لیا کہ ہم لوگ اپنے آپ کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کر لیں گے۔ چنانچہ راتوں رات ہم نے انسانوں کو مار ڈالا، اور بجلی کی مدد سے اس شہر کو اٹھا کر یہاں خلاء میں لے آئے اور اب یہ ہمارا شہر ہے۔ تانبے کے لوگوں کا شہر مگر اس بات کو بھی اب کئی سو سال گزر چکے ہیں۔"

"جب سے یہ شہر یہاں پر معلق ہے؟" جمی نے پوچھا

"ہاں۔"

"آپ لوگوں کو اپنا وطن یاد نہیں آتا؟"

"وطن کیا ہوتا ہے؟" تتلی نے پوچھا۔

"اپنے دیس کی دھرتی یاد نہیں آتی؟"

"دھرتی یعنی زمین اُس سے تو ہم لوگ سخت خلاف ہیں۔ ہم نے اپنے خوب صورت شہر کی سڑکوں، گلیوں، بازاروں سے زمین نکال پھینکی ہے۔ زمین سے کیا فائدہ۔ اُس سے بڑی غلاظت پھیلتی ہے۔ زمین کو صاف رکھنا پڑتا ہے۔ دن میں دو بار جھاڑو دینا پڑتی ہے۔ فرش دھونا پڑتا ہے۔ ان چیزوں کی کسی بھی تہذیب یافتہ شہر میں کیا ضرورت ہے۔ ہمارے شہر کی ہر گلی اور بازار میں ہوائی جہاز اور ہوائی موٹریں چلتی ہیں۔"

"مگر کس طرح؟ بجلی کہاں سے آتی ہے؟"

"سورج کی روشنی موجود ہے۔ اس سے ہم دن رات اپنے لیے بجلی پیدا کرتے رہتے ہیں۔"

"آپ لوگ کھاتے کیا ہیں؟"

"بجلی! شہر کے ہر گھر میں بجلی کا نل موجود ہے۔ صبح اٹھتے ہی ہم لوگ اپنے معدے کی ٹنکی کھول کر اس میں بجلی بھر لیتے ہیں۔ اور پھر دن بھر کام کرتے رہتے ہیں۔" "دن بھر بھلا آپ کام کیا کرتے ہیں؟" عرفی نے پوچھا۔

"واہ! اتنا بڑا شہر ہے۔ کئی لاکھ تلنے کے لوگ اس میں رہتے ہیں یہاں کام کی کیا کمی ہے۔ تم ہمارے گھر چل کے رہو تب تمہیں کچھ پتا چلے ہمارے

بارے میں۔"

عرفی ناز موہنی اور جمی نے آپس میں مشورہ کیا۔ آخر یہ طے پایا کہ وہ لوگ یہاں ایک دن کے لئے ضرور ٹھہر سکتے ہیں۔ یہاں سے چاند کا سفر چند گھنٹوں کا تھا۔ اس لئے خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔ وہ لوگ مشورہ کرکے اپنے جہاز سے اُترے اور خلائی سوٹ پہن کر تِتلی کی موٹر میں بیٹھ گئے وہ موٹر بجلی سے چلتی تھی۔ چند منٹ میں وہ لوگ تِتلی کے خوب صورت فلیٹ میں تھے۔

"آپ لوگ غسل کریں گے؟" تِتلی نے ناز اور موہنی سے پوچھا۔

"ہاں بہن! یہ تو تم نے بہت اچھی بات پوچھی۔"

"تِتلی انھیں غسل خانے میں لے گئی۔

موتیوں کی ٹائیلوں کا غسل خانہ تھا۔ آئینہ بھی موتیوں کا تھا۔ غسل خانہ میں دو نل لگے تھے اور دو فوارے۔

تِتلی نے پوچھا۔ "آپ" اے۔ سی غسل کریں گی یا ڈی۔ سی؟"

"وہ کیا ہوتا ہے؟ موہنی نے حیرت سے پوچھا۔

تِتلی کو موہنی کی جہالت کا اب اندازہ ہوا۔ ذرا نخوت سے بولی: "ہمارے ہاں کچھ لوگ اے سی بجلی سے غسل کرتے ہیں، کچھ لوگ ڈی سی بجلی سے ..... آپ کو کون سی بجلی پسند ہے۔"

"بجلی کا غسل؟ باپ رے۔ یہاں کیا پانی نہیں ہے؟" ناز بولی۔

تِتلی نے بڑی حیرت سے پوچھا: "پانی؟ پانی کیا ہوتا ہے؟"

موہنی اور ناز دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں۔ اب وہ اس

تانیے کی لڑکی کو کیا سمجھائیں؟ آخر انھوں نے فوارے کی طرف اشارہ کرکے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

تتلی نے جواب دیا "یہ فوارہ ہے۔ بٹن گھماؤ۔"

ناز نے ڈرتے ڈرتے بٹن دبایا تو فوارے سے پانی کے بجائے موتیوں کے چھوٹے چھوٹے باریک دانے (پانی کی بوندوں کی طرح) گرنے لگے۔

"کچھ لوگوں کو فوارے سے نہانا بہت پسند ہے۔ موتیوں کا ہر دانہ بجلی سے چارج ہوکر شاور سے نکلتا ہے اور جب جسم پر پڑتا ہے تو بڑا لطف حاصل ہوتا ہے۔ آپ لوگ شاور میں نہایئے۔"

اس کا تو ناز اور موہنی نے کوئی جواب نہ دیا البتہ انھوں نے آئینے کے پاس براسو کی ایک بڑی شیشی کو دیکھ کر کہا۔ "وہ کیا ہے؟"

"براسو ہے؟" تتلی نے بڑی حیرت سے پوچھا "آپ براسو بھی نہیں جانتیں۔ یہاں ہم لوگ روز صبح اٹھ کر بجلی سے غسل کرتے ہیں اور اپنے بدن کو براسو سے صاف کرتے ہیں۔ براسو سے ہمارا تانبے کا جسم صاف ستھرا رہتا ہے اور ہر وقت چمکتا رہتا ہے۔ ہمارے ہاں جو فیشن ایبل عورتیں ہیں وہ تو دن میں کئی بار براسو کا استعمال کرتی ہیں۔"

"ہم لوگ صابن استعمال کرتے ہیں۔"

"صابن؟ صابن کیا ہوتا ہے؟" تتلی نے پوچھا۔

"ایک طرح کا براسو ہی ہے!" ناز نے جواب دیا۔

تتلی نے کہا "اپنی اپنی جگہ کا دستور ہے۔ خیر یہاں جو ہے حاضر ہے۔"

یہ رہا موتیوں کا برش ۔ یہ موتیوں کی کنگھی ۔ یہ موتیوں کا تولیہ ۔ ہم لوگ تلبنے کے غریب پتلے ہیں ۔ مگر ہمارا شہر مہمان نوازی کے لئے اس کائنات میں کسی سے کم نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر پتلی غسل خانے سے باہر چلی گئی۔

خیر وہ لوگ بجلی کا غسل تو کیا کرتے ۔ یوں ہی تھوڑی دیر کے بعد باہر آگئے ۔ اتنے میں پتلی نے شہر کے میئر (MAYOR) کو ٹیلی فون کر کے بلا لیا تھا ۔ میئر بھی تلبنے کا تھا ۔ مگر اس کے تین سر تھے ۔ تاکہ اگر کسی وجہ سے دو سر سوچتے سوچتے بے کار ہو جائیں تو تیسرا کام دے سکے ۔ کبھی کبھی وہ تین سروں سے سوچتا تھا۔

میئر نے انھیں سارا شہر دکھایا ۔ بچوں نے شہر کی بہت تعریف کی ۔ خاص طور پر انھیں بچوں کا پارک بہت پسند آیا ۔ جس میں موتیوں کے درخت تھے ، اور موتیوں کی جھاڑیوں پر موتیوں کے جگمگاتے ہوئے پھول تھے ۔ ناز اور موہنی نے دو چار پھول توڑ کر اپنے بالوں میں لگائے ۔ اس پارک میں تلبنے کے بڑے بڑے پتلے چھوٹے چھوٹے پتلوں کو گود میں لئے یا انگلی پکڑائے ہوئے گھوم رہے تھے ۔

جمی نے پتلی سے پوچھا ۔ "کیا آپ لوگوں کے ہاں بھی بچے ہوتے ہیں؟"

"واہ کیوں نہ ہوں گے ؟" پتلی نے چمک کر جواب دیا ۔

"کیا ہوا اگر ہم لوگ تلبنے کے ہیں ۔ آخر ہمارے بھی تو دل ہے ۔"

"دل ہے ؟" جمی نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ہاں ہے اور بجلی سے دھڑکتا ہے! اور اس دل میں بچوں کے لئے بڑی محبت ہے!"

"تمہیں بہن، بچے پسند ہیں؟" جمی نے تُلی سے پوچھا۔

"ہاں بہت پسند ہیں۔ اور میں نے فیصلہ کیا ہے، جب میں شادی کروں گی تو ورکشاپ سے دو بہت عمدہ بچے خرید کے لاؤں گی۔"

"تو تمہارے ہاں بچے کیا ورکشاپ میں ڈھلتے ہیں؟" عرفی نے حیرت سے پوچھا۔

"اور کیا آسمان سے آتے ہیں؟" تُلی نے ہنس کر کہا،

"ورکشاپ میں جاؤ۔ جس سائز کا، جس عقل کا، جس شکل کا بچہ چاہیئے۔ لے آؤ۔ کچھ امیر لوگ خاص آرڈر دے کر بچہ بنواتے ہیں۔"

"پھر تمہارے یہاں تو بچے ہمیشہ بچے رہتے ہوں گے۔"

"اور کیا؟ بچے بچے رہتے ہیں، بڑے بڑے۔ یہ تو اپنی اپنی قسمت کی بات ہے!"

"پھر تو یہ شہر بہت برا ہے۔" موہنی برا سا منہ بنا کر بولی۔ "جہاں بچے کبھی بڑے نہ ہو سکیں۔"

عرفی نے تُلی کو غصے میں آتے ہوئے دیکھ کر بتایا کہ زمین پر کس طرح بچے بڑے ہوتے ہیں، جوان ہو کر بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ میبز بڑے غور سے عرفی کی باتیں سنتا رہا۔ آخر کہنے لگا۔

"جب ہمارے شہر پر انسانوں کی حکومت تھی، تب یہاں بھی سنا ہے،

ایسا ہی ہوتا تھا۔ مگر ہم نے اب وہ سب کچھ ختم کر دیا ہے۔ اب تو یہاں ہر چیز پلان کے تحت ہوتی ہے۔ اس شہر میں کتنے لاکھ پتلے رہ سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ ہم لوگ بناتے ہی نہیں۔ کتنے بچے اس شہر میں رہ سکتے ہیں اس سے زیادہ ہماری ورکشاپ بناتی ہی نہیں۔ یہاں کوئی بچہ بھوکا نہیں ہوتا، کوئی پتلا بے کار نہیں گھومتا۔ سب کے کھانے کے لئے بجلی ہے اور پہننے کے لئے موتی ہیں۔"

"تب تو آپ لوگ بہت خوش ہوں گے" نانا نے پوچھا۔

نانا کا سوال سن کر یکایک میئر اداس ہو گیا۔ بولا "خوشی نا پتلے کے انسانوں کی قسمت میں نہیں ہے۔ حالاں کہ ہمارے پاس سب کچھ موجود ہے۔ کھانا، پہننا، عقل، شکل کسی بات کی کمی نہیں۔ یہاں کھانا کپڑا سب کے لئے ہے۔ ہم لوگ بے وقوف اور جاہل تانبے کے پتلے نہیں بناتے۔ نہ بدصورت پتلے بناتے ہیں۔ ہمارے شہر کا ہر پتلا خوب صورت ہے۔ کیا مرد کیا عورت! یہاں کوئی بیمار نہیں پڑتا۔ ہاں سنا ہے جس زمانے میں یہاں انسان رہا کرتے تھے، یہاں شہر میں بہت سی بیماریاں ہوا کرتی تھیں، اور بہت سی وبائیں پھیلتی تھیں، مگر تانبے کے انسان ہونے سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا ہے کہ ہماری صحت کبھی خراب نہیں ہوتی۔ اور ہم میں سے کوئی بیمار نہیں ہوتا۔

"تب تو آپ لوگ بہت خوش ہوں گے"

میئر نے کہا "آپ نہیں جانتے۔ یہ شہر بہت بدقسمت ہے۔ جب یہ شہر زمین پر تھا۔ موتی کے ستارے پر تھا تو ہزاروں میل تک پھیلا ہوا تھا لیکن یہاں

فضا میں معلق ہوتے ہی یہ شہر اکیلا پڑ گیا۔ یہاں ہر وقت شہابِ ثاقب اڑ کر آتے رہتے ہیں۔ ہزاروں ٹن کے شہابِ ثاقب جس بلڈنگ سے گزر جائیں اُسے گرا کر اپنے ساتھ نیچے لے جاتے ہیں اور آپ جانتے ہیں ہم لوگ خلا میں رہنے والے ہیں۔ یہاں نہ تانبا ملتا ہے نہ موتی، جو سامان ہم ایک دفعہ اپنی زمین سے لائے تھے۔ بس وہی اپنے پاس ہے۔ آہستہ آہستہ شہابِ ثاقب کے حملوں سے یہ شہر ختم ہو رہا ہے۔ اب چند ہی سو میل کا رہ گیا ہے۔ اگلے چند سو برسوں میں یہ شہر آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا۔ اور ہماری تانبے کی تہذیب فنا ہو جائے گی ہمیشہ کے لیے! اور پھر کسی کو یاد بھی نہ رہے گا کہ کبھی یہاں تانبے کے لوگ رہتے تھے۔" میٹر کی آنکھ میں ایک آنسو جھلکنے لگا۔

بچوں کو اس پر بہت رحم آیا۔ جمی نے تتلی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تم مجھ سے شادی کر لو۔ میں تمھیں اپنے ساتھ لے چلوں گا۔"

"واہ" تتلی جھک کر بولی۔ "میں تم سے شادی کیوں کروں گی۔ تم گھٹیا لوہے کے آدمی۔ میں تانبے کی تتلی، اپنا رنگ دیکھو اور میرا رنگ دیکھو میرا تمھارا کیا میل ؟"

جمی نے کہا۔ "میں تمھیں بہت عمدہ پٹرول پلایا کروں گا۔"

تتلی بولی۔ "اے ہو بھی۔ کون یہ غلیظ پٹرول پیئے۔ میں تو بجلی سے چلتی ہوں۔"

جمی چپ ہو گیا۔ اس کے دل میں خیال آیا۔ کاش میں بھی تانبے کا ہوتا۔

تھوڑی دیر کے بعد میٹر کا ٹیلی فون آیا، اور وہ اُسے سنتے ہی گھبرا گیا۔ بولا۔ "تھوڑی دیر میں شہابِ ثاقب کا ایک طوفان ہمارے شہر سے گزرنے والا ہے۔

اب ہم کو یہ شہر کسی اور جگہ فوراً منتقل کرنا پڑے گا۔"

"کیا آپ اپنے شہر کی جگہ تبدیل کرتے رہتے ہیں ؟"

"ہاں کرنا پڑتی ہے۔ اس کا انحصار شہاب ثاقب یا دوسرے آوارہ ستارل کی گردش پر ہے۔ اس کے حساب سے ہم اپنے شہر کو فضا میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پر اڑاتے رہتے ہیں۔"

"بڑی مصیبت کا کام ہے یہ تو۔" جمی بولا۔

"زندہ رہنے کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔" میر نے جواب دیا۔

جمی نے کہا: "تو اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ ہم لوگوں کو فوراً یہاں سے چل دینا چاہیے۔"

"وہ کیوں ؟" میر نے پوچھا

جمی نے کہا: "پورے شہر کی جگہ کو تبدیل کرنے میں وقت لگتا ہوگا، اور کبھی شہاب کا طوفان وقت سے پہلے آگیا ؟"

"ایسا بھی ہوتا ہے۔" میر نے کہا: "اس صورت میں شہر کے کئی حصے مسمار ہو جاتے ہیں۔ بہت سی عمارتیں چکنا چور ہو جاتی ہیں!"

جمی نے فلیٹ کی کھڑکی کھول کر اپنی ٹیلی ویژن کی پتلیوں سے بہت دور تک دیکھا۔ اتنی دور کہ وہاں تک کسی انسان کی آنکھ یا دوربین کی آنکھ نہیں پہنچ سکتی تھی۔ یکایک اس نے کھڑکی سے سر اندر کرتے ہوئے کہا۔

"بھاگو! بھاگو!! شہاب ثاقب کا طوفان آرہا ہے!"

میر جلدی سے ٹیلی فون پر شہر کی پولیس اور فوج کو ہدایت دینے لگا۔ اور

مرکزی انجینئروں کو شہر گھما کر دوسری طرف لے جانے کے حکم دینے لگا۔ اتنے میں تُلی نے اپنی موٹر سٹارٹ کی اور عرفی، ناز، موہنی اور جمّی کو لے کر ہوائی اڈے پر پہنچ گئی۔

عرفی نے جلدی جلدی ہوائی جہاز کو سٹارٹ کیا۔ تُلی نے جلدی جلدی سب سے رخصت چاہی۔ ابھی وہ جہاز کے دروازے پر کھڑی رخصت ہو رہی تھی کہ جہاز چلنے لگا، اور کھٹ سے جمّی نے جہاز کا دروازہ بند کر لیا۔

"کھولو! کھولو!! دروازہ کھولو!!!" تُلی گھبرا کر بولی۔

جمّی نے مسکرا کر کہا: "اب یہ دروازہ تو چاند کی زمین پر جا کر کھلے گا۔"

تُلی نے دروازہ کھولنے کی بہت کوشش کی، مگر تُلی تانبے کی تھی اور جمّی فولاد کا، اور فولاد بہرحال تانبے سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔ تُلی ہار کر رونے لگی۔

موہنی نے اُسے دلاسا دیا۔ بولی: "گھبراؤ نہیں، ہم تینوں لڑکیاں بہنوں کی طرح رہیں گے۔ ہم تمہیں نئی نئی دنیا دکھائیں گے۔ ایسی جگہیں جو تم نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی ہوں گی۔ تم اُن کو دیکھ کر بہت خوش ہو گی۔"

"اور اگر تمہارا دل خوش نہ ہوا تو ہم تم کو یہیں واپس تمہارے شہر پہنچا جائیں گے۔" ناز نے وعدہ کیا۔

تُلی مان گئی۔ مگر کہنے لگی: "ایک شرط ہے، میں اس بدصورت لوہے کے لڑکے سے بالکل بات نہ کروں گی۔"

"کون؟ جمّی؟" ناز مسکرا کر بولی: "ارے یہ تو بالکل گدھا ہے۔"

تم اس کا فکر بالکل نہ کرو۔ اِدھر آؤ۔ راڈر کی مشینوں پر میری مدد کرو"
بتلی جمی کی طرف سے منہ پھیر کر ناز کے ساتھ بیٹھ گئی۔ یکایک عرفی نے
خوشی سے چلا کر کہا۔
"چاند سے سگنل آرہا ہے۔ ماہتاب ایرپورٹ قریب آرہا ہے۔"
موہنی نے خوشی سے اچھل کر جہاز کے اندر کے مائیکروفون کے بٹن کھول
دئے۔

مائیکروفون پر آواز آرہی تھی،

"ہیلو زمین کے راکٹ ہیلو۔ ہیلو، ہم سے
بات کرو، یہ ماہتاب ایرپورٹ ہے! ایرپورٹ ماہتاب!!....."
جمی نے ٹیلی ویژن کے پردے پر سب کو دکھایا۔ دُور دُور سینکڑوں
میل تک ایرپورٹ ماہتاب کی نارنجی روشنیاں جھلملا رہی تھیں، ہزاروں
گز اونچے ستونوں پر راڈر کے انٹینیا کام کر رہے تھے۔

عرفی چلایا۔
"ریکٹر ٹو لینڈ!"
"الیکٹرانکس ( ) ٹو لینڈ!!"
"شپ ماسٹر ٹو لینڈ!!!"
"ریڈی!"

جمی ناز موہنی بتلی سب نے اپنی اپنی مشینوں کو ٹیسٹ کر کے کہا، "ریڈی"
عرفی نے بریک گھمائے، اور راکٹ جہاز کی رفتار ہزاروں میل سے چند سو میل

نی گھنٹا رہ گئی، اور راکٹ فضا میں نیم دائرے کی صورت میں چکر لگا کر نیچے اُترنے لگا۔

موہنی نے کیبن کی کھڑکی سے دیکھا۔

جہاز آہستہ آہستہ چاند کی زمین پر اُتر رہا تھا۔

جب بچوں کا راکٹ جہاز ماہتاب ایرپورٹ پر اتر گیا، تو بچے مارے خوشی کے کھڑکی سے جھانک جھانک کر باہر دیکھنے لگے۔ ہزاروں سال سے بچوں نے چندا ماما کی کہانی سُنی تھی اور اپنے ننھے مُنے دل میں چاند کو حاصل کرنے کی خواہش کی تھی، انھوں نے جھیل میں تالاب میں دریا میں سمندر میں اور کہیں نہیں تو آئینے ہی میں چاند کے عکس کو دیکھ کر اپنا دل بہلا لیا تھا۔ لیکن چاند تک وہ پہنچ نہ سکے تھے۔ کیوں کہ اب تک ایسے تیز ہوائی جہاز نہ بن سکے تھے جو انسان کو چاند تک پہنچا سکتے۔ لیکن آج یہ ناممکن بات بھی ممکن ہو گئی تھی۔ اور انسان کے بچے پہلی بار چاند کی زمین پر قدم رکھ رہے تھے! وہ بے حد خوش تھے، اور کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے چاند دیس میں بسنے والے لوگوں کی شکلیں دیکھنے کے لئے بہت بے تاب نظر آتے تھے۔

لیکن جب آدھ گھنٹا گزر گیا۔ اور انھیں لینے کے لئے کوئی نہیں آیا تو بچے بہت حیران ہوئے۔ تتلی بہت خفا ہو کے بولی۔

"نوج، میں یہاں آئی؟ کیسے بدتمیز ہیں یہاں کے لوگ۔ یہ بھی نہیں سوچتے اتنی دور سے چل کے ان کے گھر میں مہمان آئے ہیں!"

"مگر تم کو بُلایا کس نے تھا؟" یکایک جہاز کے اندر کے مائکروفون سے

زور سے ایک آواز آئی۔ سب چونک پڑے اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ سب حیرت میں رہ گئے، یہ آواز کدھر سے آئی تھی۔ اس سے پہلے جب وہ ایرپورٹ پر اتر رہے تھے تو برابر جہاز کو اترنے کے لئے ہدایات چاند کے اڈے پر سے دی جا رہی تھیں، اب وہ سب آوازیں بھی بند تھیں۔ عرفی نے مائیکروفون پر کئی بار "ہیلو ہیلو، ایرپورٹ ماہتاب۔ ہم سے بات کرو، کہا، مگر کسی نے اس کا جواب تک نہیں دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے چاند کے ہوائی اڈے پر کوئی ہے ہی نہیں۔

تھوڑی دیر اور انتظار کرنے کے بعد آخر عرفی نے کہا "میرے خیال میں تو اب جہاز سے اتر کر خود دیکھنا چاہیئے۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ تم سب لوگ اپنے اپنے خلائی سوٹ پہن لو اور آکسیجن کی دونوں نلکیاں اپنی اپنی جیب میں رکھ لو۔ کیوں کہ چاند پر ہوا نہیں ہے۔"

راکٹ سے اتر کر بچوں کو چاند پر قدم رکھنا بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ ایک تو چاند پر پہنچتے ہی وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کا وزن ایک چوتھائی رہ گیا ہے۔ جمی اپنے آپ کو بالکل ہلکا سا محسوس کر رہا تھا۔ وہ دو ایک بار اچھلا تو پندرہ بیس فٹ اوپر فضا میں اچھل گیا۔ بے حد خوش ہوا۔ کیوں کہ زمین پر تو وہ اس قدر بھاری تھا کہ ایک فٹ اچھلنا بھی اس کے لئے محال تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے بچے بھی اچھلنے لگے۔ اور بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا، گویا انسان کے بچے مینڈکوں کی طرح اچھل کود رہے ہیں، پتلی بھی بے حد خوش ہوئی کیوں کہ وہ جمی سے کہیں زیادہ اچھل سکتی تھی۔ پتلی جمی کو چڑاتے ہوئے بولی "ارے تم لوہے کے بدھو! کیا

اُچھلو گے۔"

موہنی نے تِتلی سے پوچھا۔ "چاند تمہیں کیسا لگا۔"

تِتلی بولی۔ "بھئی یہ بات تو مجھے بہت پسند آئی، چاند کی، یہاں آکے وزن بہت ہلکا ہو جاتا ہے۔ اپنے شہر میں تو میں اس قدر تیز کبھی نہ چل سکتی تھی، مگر یہ کیا بات ہے۔ ہمیں لینے کے لئے کوئی نہیں آرہا ہے۔ یہ پورا ہوائی اڈہ بالکل ویران اور سنسان پڑا ہے۔"

واقعی اب جوجی اور عرفی اور دوسرے بچوں نے دیکھا تو انھیں کہیں کوئی انسان یا انسان نما جانور یا کوئی چلتی پھرتی چیز نہ دکھائی دی۔ ہوائی اڈے کا فرش نیلے رنگ کے کسی کانچ کا تھا۔ لیکن جب عرفی نے اسے اچھی طرح سے دیکھا تو حیران ہو کر چلانے لگا۔ "ارے یہ تو نیلم ہے! "نیلم۔"

"ہاں ہوائی اڈے کا فرش نیلم کا ہے! دیکھ لو۔"

واقعی جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی، زمین پر نیلم ہی نیلم بچھا ہوا نظر آتا تھا۔ اور سورج کی شعاعوں میں اس قدر چمک رہا تھا۔ کہ نگاہ نہ ٹکتی تھی۔ بچے حیرت سے اُسے دیکھتے آگے بڑھے، تو انھیں ہوائی اڈے کی عالی شان سبز رنگ کی عمارت دکھائی دی۔ (جو اس قدر نازک اور شفاف پتھروں سے بنائی گئی تھی کہ آپ بلڈنگ کے باہر سے بلڈنگ کے اندر کے حسین کمرے بھی دیکھ سکتے تھے۔ بلڈنگ کے اندر داخل ہو کر بڑے ہال کے بیچے عالی شان ستون نظر آتے تھے۔ جو سینکڑوں فٹ اونچی چھت کو سنبھالے

ہوئے تھے۔ ان ستونوں کا رنگ شفاف گلابی سا تھا۔ اور آب موتیوں کی سی تھی
جمی نے ایک ستون کو ہاتھ لگا کے کہا۔

"ارے یہ تو ہیرے کے بنے ہوئے ہیں، ہیرے کے! واقعی!!"
موہنی نے چھت کی طرف نگاہ اٹھا کر کہا، "اوپر تو دیکھو۔"
سب بچوں کی نگاہیں اوپر اٹھیں، دودھیا رنگ کے بلبوں کی چھت
میں گہرے سرخ رنگ کے یاقوت اور لعل سے بنے ہوئے بڑے بڑے فانوس
لٹک رہے تھے۔ ایک ایک پتھر کوہ نور سے بہتر قیمتی اور خوب صورت دکھائی
دیتا تھا۔

"اتنے ہیرے تو ہماری ساری دنیا میں کہیں نہ ہوں گے، جتنے یہاں چاند
کی ایک ایرپورٹ کی بلڈنگ میں لگے ہوئے ہیں!"
عرفی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ کر کہا،
"مگر یہاں کوئی ہے نہیں!" موہنی بڑی مایوسی سے بولی۔
پر اس نے چلا کر کہا: "ہیلو، چندا ماما!"
کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ بچوں نے گھوم گھوم کے ہر کمرے میں دیکھا،
کہیں کوئی نظر نہ آیا۔ کمروں میں میزیں تھیں، کرسیاں تھیں، کاغذ اور فائلیں
تھیں، قلم دوات پنسلیں، سیاہی چوس تک تھے۔ مگر کوئی آدمی انھیں وہاں
کام کرتا ہوا نظر نہ آیا۔ گھومتے گھومتے وہ لوگ کینٹین میں جا پہنچے۔ یہ سوچ کر
کہ یہاں تو کوئی آدمی انھیں کھانا کھلائے گا۔ مگر وہاں پر بھی کوئی نہ تھا۔ البتہ
میزوں پر چھوٹی چھوٹی طشتریوں میں ہیرے، موتی، نیلم، زمرد، مرجان، یاقوت

پکھراج، پنے اور لعل سجے ہوئے تھے۔

موہنی نے زور سے چلا کے کہا: "ارے بھئی ایک کپ چائے لاؤ!"

مگر معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آواز کسی نے نہیں سُنی؛ یہاں تک کہ جُگنوں نے بھی نہیں سنی، ان کو موہنی کے ہونٹ ہی ہلتے ہوئے نظر آئے۔ اس نے جمی نے پوچھا۔ "کیا کہہ رہی ہو، مجھے تو بس تمھارے ہونٹ ہلتے ہوئے نظر آتے ہیں، آواز تو سنائی نہیں دیتی۔"

عرفی نے کہا: "موہنی تمھیں جس سے بات کرنا ہو اس کے کان کی سیدھ میں بولو۔ یہاں ہوا نہیں ہے۔ اس لئے آواز بندوق کی گولی کی طرح ایک ہی رُخ پر چلتی ہے۔ اور سیدھی آگے کو نکل جاتی ہے، اگر بات کان کی سیدھ میں نہ کرو گی، تو تمھاری آواز بھی سنائی نہ دے گی۔"

"پھر یہ آواز کہاں جائے گی؟" موہنی نے پوچھا،

"ایک لمحے میں ہزاروں میل دُور چلی جائے گی۔"

موہنی بولی: "مجھے ایک کپ چائے چاہیئے، اور یہاں ہوٹل میں مجھے تو ان قیمتی ہیروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔"

جمی بولا: "چلو۔ بلڈنگ سے باہر چلیں، دیکھیں چاند کا دیس کیسا ہے۔"

بلڈنگ سے باہر لال رنگ کی ایک سڑک تھی جو دور تک بڑی بڑی چٹانوں، گہری گھاٹیوں اور اونچی نیچی پہاڑیوں کے بیچ میں چلی جا رہی تھی۔ وہ سب لوگ اس سڑک پر ہولئے، چاروں طرف آدم نہ آدم زاد،

نہ کوئی جانور، نہ چڑیا، نہ درخت، نہ جھاڑی بس سیاہ اور پیلے رنگ کا لاوا جگہ جگہ جما ہوا تھا، چٹانوں کا رنگ سرمئی تھا، اور سڑک پر اس شفاف سنہرے رنگ کی چھنی ہوئی مٹی بکھری تھی، جیسے سنہرے رنگ کا غبار! نازنے اس مٹی کو ہاتھ لگاکے دیکھا تو حیرت سے چلاّکے بولی۔" ارے یہ تو سونا ہے سونا!"

واقعی اب ان بچوّں نے سڑک کی مٹی کو اپنے ہاتھ میں اٹھاکر دیکھا، تو چمکتا ہوا سونا نظر آیا، عرفی نے اپنی ایک جیب سونے سے بھرلی۔ دوسری جیب میں اس نے قیمتی ہیرے بھر رکھے تھے۔ دوسرے بچوں نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ چلتے چلتے دوپہر ہوگئی، اور سڑک تھی کہ سیدھی سپاٹ چلی جا رہی تھی۔ کہیں پر کوئی موڑ نہ تھا، چلتے چلتے دوپہر بھی ڈھل گئی، آسمان کا رنگ نیلا نہ تھا بلکہ فضا میں اڑنے والی سونے کی دھول کی وجہ سے گہرا سنہری مائل تھا۔ اور سورج کی کرنوں سے اس طرح جھلملاتا تھا۔ گویا اس نے آسمان کے اس کونے سے اس کونے تک سنہری سہرہ باندھ دیا ہو، پھر چلتے چلتے شام ہوگئی، اور سورج اک گہرے لال رنگ کے سمندر میں ڈوب گیا اور یکایک سارے آسمان پر اندھیرا چھا گیا اور زرد زرد لاکھوں تارے جگنوؤں کی طرح بکھر گئے! اب بچے بالکل گھٹا ٹوپ اندھیرے میں چل رہے تھے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے، اندازے سے اب تک وہ پندرہ بیس میل آگئے ہوں گے۔ ان کے قدم بہت تیز مگر بہت ہلکے ہلکے سے پڑ رہے تھے۔ اور کم وزن ہونے کی وجہ سے اب تک وہ تکان محسوس

نہ کرتے تھے۔ اتنا فاصلہ اگر انھوں نے زمین پر طے کیا ہوتا، تو اب تک تھک کر چور چور ہو گئے ہوتے۔

چند میل اسی طرح چلنے کے بعد یکایک عرفی کا سر ایک دیوار سے ٹکرایا اور اس نے اپنے دوسرے ساتھیوں کو خبردار کرتے ہوئے کہا "رک جاؤ!"

جمی اور تتلی، ناز اور موہنی عرفی کے پیچھے پیچھے رک گئے!

عرفی نے دیوار پر چاروں طرف اپنا ہاتھ پھیرا، دیوار بالکل ہموار اور صاف تھی۔ یکایک عرفی کا ہاتھ ایک بٹن پر پڑا۔ عرفی نے ڈرتے ڈرتے اس بٹن کو دبا دیا۔

بٹن دبلتے ہی دُور دُور تک اندھیرا چھٹ گیا، اور چاروں طرف ہلکی بے داغ دودھ کی طرح ملائم اور نرم روشنی پھیل گئی، عرفی نے اور دوسرے بچوں نے سر اٹھا کے دیکھا تو انھیں اپنے سامنے ایک بہت اونچی سفید رنگ کی دیوار دکھائی دی، جس کے اندر ہلکے آسمانی رنگ کا ایک خوشنما سا دروازہ تھا۔ اور اس دروازے کے اوپر چاندی کے حرفوں میں لکھا تھا۔

چاند دیس!

پھر چند لمحوں کے بعد دھیرے دھیرے یہ دروازہ کھلا، اور خوب صورت نغمے سنائی دینے لگے، اور بچوں کے سر پر چاندی اور سونے کے تار گرنے لگے، عرفی ڈرتے ڈرتے دروازے کے اندر گھسا، تو وہ اور اس کے ساتھی بچے دروازے کے اندر کی خوب صورت دنیا کو دیکھ کر اچنبے میں رہ گئے، ایک ہلکی ہلکی اور سہانی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ آسمان بہت شفاف اور ہلکے سے نیلے رنگ کا تھا۔ کہیں کہیں سرو کی طرح نازک اور خوب صورت

سے درخت نظر آتے تھے، لیکن ان درختوں کے پتے، ٹہنیاں سب چاندی کے بنے ہوئے معلوم ہوتے تھے، دور سامنے پانی کے رنگ کا ایک اونچا پہاڑ کھڑا تھا، جس کی چوٹی سے گویا پگھلی ہوئی چاندی کا ایک آبشار گر رہا تھا۔

جب بچے دروازے کے اندر آئے، تو انھوں نے اپنے آپ کو خوب صورت عورتوں کے جھرمٹ میں پایا، ان عورتوں کے کندھوں پر چاندنی کے پر تھے۔ اور سر سے پیر تک چاندنی کی بنی معلوم ہوتی تھیں، جب وہ چلتی تھیں، تو ان کے قدموں سے چاندی کی گھنٹی کی صدا آتی تھی، جب وہ بات کرتی تھیں، تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا چاندنی کی کرن بول رہی ہے۔ ان کے ساتھ جو مرد تھے، وہ بھی خوب صورت سفید پروں والے تھے۔ اور سر سے پیر تک چاندی میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ یہاں ہر چیز جو نظر آئی۔ وہ بے حد خوب صورت اور شفاف اور گویا دودھیا رنگ کی دھند میں کھوئی کھوئی سی معلوم ہوتی تھی ہوا میں اک ہلکی ہلکی بیند لانے والی مہک تھی۔ انھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ چاند دیس نہ ہو خواب صورت چاندنی کا سپنا ہو۔

ناز بولی: "ہائے یہ چاند دیس کتنا خوب صورت ہے!"

پتلی بولی: "اور یہاں کے لوگ کتنے خوب صورت ہیں۔ میں نے تو ایسے خوب صورت لوگ دنیا میں کہیں نہیں دیکھے!"

پتلی نے بڑی حقارت سے جمی کی طرف دیکھا۔ اور بولی: "ذلیل لڑکے! تم کتنے بدصورت ہو۔" یہ کہہ کر اس نے جمی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

جمی کو غصہ تو بہت آیا، مگر چپ رہا۔ اتنے میں چاند دیس کا ایک بہت

خوب صورت مرد تیلی کے پاس آیا۔ اور اس سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرنے لگا ایک عورت نے جو سب سے آگے تھی اور سب کی ملکہ معلوم ہوتی تھی۔ اور سب سے زیادہ خوب صورت تھی، اس نے عرفی کا ہاتھ پکڑ کے کہا " آیئے۔ خوش آمدید چاند دیس میں زمین دیس کے بچوں کو خوش آمدید کہتی ہوں، آیئے، ہم نے آپ کے اعزاز میں ایک بہت بڑی گارڈن پارٹی کا انتظام کیا ہے، تشریف لایئے۔"

وہ لوگ ایک چاندی کے ایک بڑے گول غالیچے پر ملکہ کے ساتھ بیٹھ گئے، جب سب لوگ بیٹھ گئے، تو ملکہ نے چاندی کی چھڑی سے غالیچے کو چھوا اور وہ ہوا میں اڑنے لگا۔

اور بچے چاند دیس کی سیر کرنے لگے، دھیمی دھیمی رفتار میں لوگ اڑے چلے جا رہے تھے، ان کے نیچے سے خوب صورت محل، قلعے، دریا، شہر، گاؤں اور قصبے، کھیت، میدان، پہاڑ، باغ اور جنگل گزرتے جا رہے تھے۔ ہر چیز اپنی زمین کی طرح تھی لیکن ہر چیز کا رنگ یہاں سفید تھا، بلکہ شفاف دودھیا چاندنی کے رنگ کا سا تھا۔

پندرہ بیس منٹ تک اسی طرح اڑنے کے بعد ملکہ نے غالیچے کو پھر اپنی چاندی کی چھڑی سے چھوا، اور غالیچہ دھیرے دھیرے ایک خوب صورت باغ میں اتر گیا، اس باغ میں جتنے بھی پھل تھے وہ چاندی کے فواروں سے جو پانی اچھلتا تھا وہ پگھلی ہوئی چاندی کا معلوم ہوتا تھا اور روش روش پر جو پھول کھلے ہوئے تھے، وہ بھی چاندی کے تھے۔ موہنی نے ایک پھول توڑ کر اپنے بالوں میں ٹانکنا چاہا۔ تو وہ پھول توڑ نہ سکی۔ پھول کی ہانڈی اک کرن کی طرح

شفّاف تھی، پھول کی پتیاں بھی اسی طرح شفّاف تھیں۔ اور جب موہنی نے انھیں توڑنا چاہا تو وہ اس کی انگلیوں کے آر پار ہو گئیں۔ اس طرح جب ناز نے فوارے کے پانی کو ہاتھ لگایا تو اس کا ہاتھ بالکل گیلا نہ ہوا، جمی نے جب دیکھا کہ چاند دیس کا ایک خوب صورت آدمی تیلی کا ہاتھ پکڑے اُسے لیے لیے گھومتا ہے، تو اُسے بہت غصّہ آیا۔ اس نے اس آدمی کو زور سے ایک گھونسا مارا، مگر جمی کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب اس کا گھونسا اس آدمی کے آر پار ہو گیا، مگر اُسے کوئی نقصان نہ پہنچا سکا۔ جمی کو ایسا محسوس ہوا، گویا اس کا ہاتھ دُھنی ہوئی روئی سے بھی شفاف اور ملائم چیز کو چھُو کر واپس آیا۔ وہ آدمی جمی کو دیکھ کر اس طرح مسکراتا رہا۔ اور بولا "بھائی، میں چاندنی کا بنا ہوا ہوں، تمہارا مکّہ مجھ پر سے گزر جاتا ہے، اور مجھے کچھ محسوس بھی نہیں ہوتا، اگر یقین نہ آئے تو ایک مکّا اور مار کے دیکھو۔

جمی نے اسے دس بارہ مُکّے مار کے دیکھے، اس آدمی کے زرا بھی چوٹ نہ لگی۔

عرفی نے ملکہ سے پوچھا "میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ آپ کے ایرپورٹ پر ہمیں لینے کے لئے کوئی موجود نہ تھا۔"

ملکہ نے مسکرا کے کہا "ہم سب لوگ وہاں موجود تھے۔"

"مگر ہم نے تو آپ کو نہیں دیکھا" عرفی نے بڑی حیرت سے کہا۔

ملکہ اک آہ بھر کر بولی "اس کی وجہ یہ ہے، کہ ہم لوگ چاندنی کے بنے ہوئے ہیں، چاندنی دن میں کسی کو نظر نہیں آسکتی۔ نہ ہماری آواز دنیا میں

کسی کو سنائی دے سکتی ہے، اس لیے گو ہم نے آج دن میں تمھیں چلاّ چلاّ کے خوش آمدید کہا، مگر تم نہ تو ہمیں دیکھ سکے، نہ ہماری آواز سن سکے۔ ہم لوگ تو صرف رات کو نظر آسکتے ہیں۔ اور رات ہی ہمارا دن ہے۔ دن کو اکثر ہم لوگ کوئی کام نہیں کرتے اور جہاں ہوتے ہیں وہیں پڑ کر سو جاتے ہیں۔ ہمارے دیس میں سب کام رات کو ہوتا ہے۔ اور دن سونے کے لیے ہوتا ہے۔"

ناز نے پوچھا "تو یہاں جتنی چیزیں نظر آرہی ہیں وہ سب چاندنی کی بنی ہوئی ہیں" اور کہا۔ یہ درخت، پھول، پھل، پتے، آبشار، پہاڑ، جھیلیں سب چاندنی کی کرنوں سے بنی ہیں۔"

تھوڑی دیر میں شفاف نقرئی میزوں پر چاندی کے برتن سج گئے اور ان میں خوشنما مٹھائیاں، کیک، اور طرح طرح کے کھانے کی چیزیں جیسے یہ بچے زمین پر کھاتے آئے تھے، دکھائی دینے لگیں۔ لیکن یہاں ہر چیز چاندنی کی طرح شفاف تھی۔ گلاب جامن، امرتی، موتی چور کے لڈو، اور حلوہ سوہن ہر چیز کا رنگ سفید تھا، چاندی کے گلاسوں میں بھی اب شفاف پانی بھرا ہوا تھا، لیکن جب وہ لوگ پانی پیتے ایسا لگتا جیسے انھوں نے کچھ پیا ہی نہیں۔ گلاس خالی ہو جاتا مگر ان کے پیٹ میں کچھ نہ پہنچتا، لڈو اٹھا کر وہ لوگ منہ میں رکھتے۔ جبڑے چلنے لگتے، مگر یہ محسوس نہ ہوتا کہ انھوں نے لڈو کھایا بھی ہے، بچے بڑے حیران ہوئے کہ یہ کس طرح کا کھانا ہے۔ اور کس طرح کی مٹھائیاں ہیں، جن کا نہ کوئی ذائقہ ہے، نہ ان کے کھانے سے بھوک کم ہوتی ہے۔"

جب عرفی نے ملکہ سے پوچھا تو اس نے بتایا "یہ کھانا بھی چاندنی سے تیار کیا جاتا ہے، ہم لوگ چوں کہ چاندنی کے بنے ہوئے ہیں، اس لئے ہماری بھوک تو اس سے ختم ہو جاتی ہے، مگر آپ لوگ ـــــ گوشت پوست کے انسان ہیں۔ اور آپ کے ساتھ یہ دو ہستیاں تو تانبے اور فولاد کی ہیں اب ہم لوگ کیا کریں، دراصل اس کائنات میں یہ بڑی مصیبت ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی بدنظمی ہے، یہاں مختلف سیاروں اور ستاروں کے لوگ مختلف عناصر کے بنے ہوئے ہیں۔ ان کے اپنے اپنے نظام زندگی ہیں۔ آپ کا نظام شمسی ہے، تو ہمارا نظام ارضی ہے، یہاں ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے ہوئے ہے۔ اس سے کوئی کائنات میں اس قدر بے ترتیبی پھیل چکی ہے کہ میں تو سوچ سوچ کے عاجز آ چکی ہوں۔ میرے خیال میں تو کائنات میں اک انقلاب لانے کی ضرورت ہے۔ مختلف سیاروں اور ستاروں کے مختلف عناصر کو ایک رشتے میں پرونے کی ضرورت ہے۔ میرا نعرہ ہے!

"کائنات کے ستارو! ایک ہو جاؤ!"

"ہیرا! ہیرا!" تیلی نے ملکہ کی گفتگو کی حمایت کرتے ہوئے کہا "دیکھیے دیکھیے نا، میں ایک غریب شہر کی رہنے والی ہوں، یوں تو ہمارا شہر کائنات میں سب سے خوب صورت اور موتیوں کا بنا ہوا ہے۔ مگر مصیبت دیکھیے کہ ہمارے ہاں دن میں دو دو تین تین بار شہاب ثاقب کے طوفان آتے رہتے ہیں۔ اور ہر مرتبہ ہمیں اپنے شہر کی جگہ تبدیل کرنا پڑتی ہے۔ اب آپ ہی خیال کیجیے، کہ اس طرح سے کوئی شہر کبھی ترقی کر سکتا ہے؟"

"پھر دُم دار ستارے کو دیکھیے"۔ جمی غصے سے بولا۔ اس کی گردش کا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ ایک احمق اونٹ کی طرح جدھر چاہے تھوتھنی اٹھا چل دیتا ہے بڑی مشکل سے جان بچائی ہے راستے میں اس سے"۔

عرفی نے کہا۔ ہیولا ہے کہ پھیلتا ہی جا رہا ہے۔ دوسرا ہیولا ہے کہ سکڑتا ہی جا رہا ہے۔ کہیں کوئی ہائیڈروجن گیس کا بنا ہوا ستارہ ہمارے سورج سے ایک لاکھ گنا بڑا یکا یک پھٹ پڑتا ہے اور لاکھوں چھوٹے چھوٹے ستارے برباد ہو جاتے ہیں، ایسے ستارے جو پیارے ہوتے جا رہے تھے۔ جن پر کبھی ہماری زمین کی طرح ہوا چلتی، سمندر سے اٹھ کر بادل گرجتے، درخت اور جانور پیدا ہوتے ہیں، انسانوں کی طرح کوئی ذہین مخلوق جنم لیتی، مگر اس ایک ہائیڈروجن دھماکے نے سب کچھ ختم کر دیا۔

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مُرجھا گئے!"

ناز اداس ہو کے بولی "واقعی اس کائنات میں بڑی ناانصافی ہو رہی ہے!"

چاند کا وہ خوب صورت مرد جو تیلی کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا ہنس کر بولا "ارے بھائی چھوڑو یہ بے کار باتیں۔ خوب صورت باتیں کرو"۔

ملکہ نے مسکرا کر کہا "ٹھیک کہتے ہو، چندرن! ذرا سازندوں کو بلاؤ۔

چندرن نے ایک اشارہ کیا ایک اسٹیج پر سے پردہ سا ہٹا اور اک

رقص شروع ہو گیا۔ ہر چیز دُھلی دُھلی اور خواب کی سی کیفیت لئے ہوئے تھی۔ گیت اور رقص بھی ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس سے پہلے کہیں کے سُنے ہوئے ہیں!

جب عرفی نے ملکہ سے پوچھا۔ تو اس نے بتایا،" یہ تو ایک قدرتی بات ہے۔ ہم لوگوں کا کلچر، تہذیب رہن سہن، زمین کے باشندوں سے بہت متاثر ہے۔ کبھی چاند بھی زمین ہی کا ایک ٹکڑا تھا۔

رقص بہت عمدہ تھا، گیت بڑے میٹھے تھے۔ اور دُھنیں ایسی خواب آور اور مست کر دینے والی تھیں کہ تھوڑی دیر میں بچوں کو نیند آنے لگی، اور وہ لوگ گیت سنتے سنتے وہیں سو گئے۔

صبح کو وہ لوگ جب اٹھے، تو وہاں پر نہ کوئی باغ تھا، نہ پھول تھے نہ پھل، نہ ملکہ تھی، نہ اس کے درباری، وہاں نہ شفاف پہاڑ تھے، نہ آبشار نہ جھیلیں، نہ گیت نہ نغمے، نہ کھلونے، وہاں تو کچھ بھی نہ تھا، ان کے سر پر سورج چمک رہا تھا، اور وہ لوگ ایک کھائی میں لیٹے تھے، اور ان کے چاروں طرف چاند کے دہکتے ہوئے آتش فشاں پہاڑ کھڑے تھے!

دیر تک اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد بھی جب بچوں نے چاروں طرف ویرانی ہی ویرانی دیکھی تو وہ لوگ چاند سے بہت مایوس ہو گئے۔ بچوں کو چاند کا یہ حصہ بالکل نہ بھایا۔

عرفی کہنے لگا: "بھلا جہاں آدم ہو نہ آدم زاد، وہاں اگر ہیروں کے کے پہاڑ بھی کھڑے ہوں تو کس کام کے؟"

پتلی بولی: "نوج۔ کوئی ایسی جگہ آئے۔ یہ چاند کے رہنے والے بھی کیسے ہیں۔ رات کو نظر آتے ہیں۔ اور دن کو غائب۔"

شریر موہنی چمک کر بولی: "اگر میری آنکھیں اُلّو یا بلّی کی سی ہوتیں تو میں چاند باسیوں کو دن میں بھی دیکھ لیتی۔"

جمّی بولا: "عرفی بھیّا! میرے خیال میں تو چاند کی دوسری طرف جاکر دیکھنا چاہیئے، وہاں کیا ہے۔ یہ اِدھر والا چاند جو ہم زمین والوں کو اتنی دور سے اتنا پیارا معلوم ہوتا ہے بالکل مزے دار نہیں ہے۔"

سب نے جمّی کی یہ تجویز مان لی کہ ہمیں چاند کی دوسری طرف ضرور جانا چاہیئے۔

ناز بولی: "اور ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہم چاند میں کیوں آئے تھے؟"

"امن کی فاختہ، ڈھونڈنے کے لئے!" موہنی بولی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ مگر اس ویرانے میں جہاں ہوا ہے نہ پانی جنگل ہیں نہ پیڑ، جہاں اپنے سوا اور کسی جان دار کی صورت نظر نہیں آتی وہاں اپنی فاختہ آکر کیا کرے گی؟"

تھوڑی دیر اسی طرح سوچ وچار کرنے کے بعد سینچے ماہتاب بریوٹ واپس گئے اور اپنے راکٹ میں بیٹھ کر چاند کی دوسری طرف پرواز کر گئے۔

آہا دوستو! کیا بیان کروں میں چاند کی دوسری طرف کا حال چاند کا یہ ہماری طرف والا رُخ جتنا ہی اجاڑ اور ویران تھا۔ اس کے دوسری طرف اتنی ہی شادابی اور پُر بہار فضا تھی۔ تمام سطح زمین پر نیلے رنگ کی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ بھوری مٹی کہیں بھی نظر نہ آتی تھی۔ جگہ جگہ خوب صورت درختوں کے کُنج تھے، اور ہر درخت کی اپنی خوشبو تھی۔ کوئی گلاب کی طرح مہکتا تھا تو کسی میں سے موتیے کی خوشبو آتی تھی۔ تمام پتوں کا رنگ سنہرا تھا اور تمام پھول سفید تھے ندی نالوں میں پگھلی ہوئی چاندی بہتی تھی۔ بادلوں کا رنگ گلابی تھا بادل آسمان پر بہت اونچے نہیں اڑتے تھے۔ بلکہ درختوں کی چوٹیوں کو چھو کر نکلتے تھے ان میں سے پانی کے بجائے موسیقی کی بارش ہوتی تھی اور دھیمے دھیمے سُروں میں خوب صورت راگ ہر وقت برستے رہتے تھے۔ جیسے ہی موسیقی کی یہ بارش زمین پر ہوتی، کسان لوگ کھیتوں میں ہل چلانے لگتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے موسیقی کے پودے بڑے ہو جاتے۔ یہاں کے کسانوں کو فصل اگلنے کے لئے زیادہ کام نہیں کرنا پڑتا

تھا۔ پودے آپ ہی آپ بڑے ہوتے رہتے۔ ہل چلانے کے بعد کسانوں کو دن میں تین دفعہ اپنے کھیتوں میں بانسری بجانا پڑتی تھی۔ بانسری کی آواز سُن سُن کر پودے بڑھتے رہتے تھے۔ کوئی کسان بانسری بجاتا تھا تو کوئی جلترنگ، کوئی ستار تو کوئی رباب!

جیسے ہمارے ہاں طرح طرح کے اناج ہوتے ہیں۔ ایسے ہی وہاں بھی قسم قسم کے پودے اور مختلف اناج تھے۔ کسی کا نام سہاگ تھا تو کسی کا نام پوریا۔ کوئی ملہار تھا تو کوئی درباری! ہر شخص اپنی پسند کا راگ کھاتا تھا۔ جس طرح ہماری زمین پر لوگ اپنی پسند کا اناج کھاتے ہیں۔ کسی کو چاول پسند ہے تو کسی کو گیہوں کی روٹی۔ اسی طرح وہاں کے لوگ اپنی اپنی پسند کا راگ کھاتے تھے۔ وہ لوگ اس اناج کو اپنے منہ سے نہیں بلکہ اپنے کانوں سے کھاتے تھے اور منہ سے صرف جھوٹ بولتے تھے۔

اس بات کا پتا بچوں کو اس وقت چلا۔ جب وہ اپنے راکٹ کو چاند کی دوسری طرف اتارنے میں کامیاب ہو گئے۔ سب سے پہلے ان کی نظر انسانوں کے ایک غول پر پڑی جو چھٹے پرانے چیتھڑے لگائے ان کی طرف دیکھ کر گالیاں بک رہے تھے۔ اور کہہ رہے تھے "چلے جاؤ نہیں تو جان سے مار دیں گے۔ ہماری زمین پر قدم رکھنے کا تمھیں کیا حق ؟ زمین کے احمقو! ہمارے چاند کو اپنی لالچی نگاہوں سے ناپاک مت کرو۔ چلے جاؤ یہاں سے!"

یہ سن کر بچوں نے سوچا جس ملک کی مہمان نوازی کی یہ حالت ہو،

وہاں سے چلے جانا ہی ٹھیک ہے۔ یہ سوچ کر وہ لوگ اپنے راکٹ کی طرف واپس ہونے کو تھے ہی کہ ایک آدمی جوان میں سب سے زیادہ بدصورت، گندہ اور میلا نظر آتا تھا آگے بڑھا اور عرفی کے نزدیک آکر آہستہ سے کہنے لگا: "آپ چلے جا رہے ہیں؟ حیرت ہے! ہم لوگ تو آپ کو خوش آمدید کہنے کے لئے لٹکے ہوئے ہیں۔"

"کیا مہمانوں کو اسی طرح خوش آمدید کہا جاتا ہے؟" عرفی نے غصے سے پوچھا۔

"آپ خفا نہ ہوں۔" وہ آدمی بڑی عاجزی سے بولا۔

"یہاں کا دستور ہی ایسا ہے جس جگہ پر آپ اُترے ہیں، یہ جھوٹوں کا شہر کہلاتا ہے۔ ہمارے بادشاہ کا حکم ہے کہ اس کی رعایا کا کوئی آدمی سچ نہ بولے۔ جو بولے سو جھوٹ بولے۔ اس لئے جب ہم آپ کو کہتے ہیں چلے جاؤ تو اس کا مطلب ہے آ جاؤ! جب ہم آپ کو احمق کہتے ہیں تو اس کا مطلب ہے آپ بڑے عقل مند آدمی ہیں۔"

"آپ بڑے چغد ہیں۔" عرفی نے جھنجھلا کر کہا۔ "اور نہایت بے ہودہ ہے آپ کا بادشاہ!"

"واہ! واہ! کیا تعریف کی ہے آپ نے ہمارے بادشاہ کی۔ بادشاہ سلامت سنیں گے تو بے حد خوش ہوں گے۔"

جمی نے پوچھا: "یہاں اگر کوئی سچ بولنا چاہے تو کیا کرے؟"

سچ بولنے کے لئے راشن کارڈ بنوانا پڑتا ہے۔ اور دن میں تین بار سے

زیادہ آپ سچ نہیں بول سکتے۔ ایک بار صبح، دوسری بار، دوپہر، تیسری بار شام
مگر یہاں کے لوگ بہت غریب ہیں۔ ہر روز سچ نہیں بول سکتے۔ اور یہاں
کا بادشاہ بھی بہت ظالم ہے۔ اتنے کم راشن کارڈ دیتا ہے کہ لوگ سچ کے
لئے ترستے ہی رہتے ہیں"۔ اس آدمی نے جواب دیا۔

"مگر تم اسی وقت یہ سچ کیوں بول رہے ہو؟" نازنے پوچھا۔

"میں یہاں محکمہ خارجہ کا وزیر ہوں"۔ وہ آدمی بولا "مجھے بادشاہ
نے اختیار دے رکھا ہے جب چاہوں سچ بولوں جب چاہے جھوٹ بولوں۔
جی چاہے تو جھوٹ اور سچ دونوں کو ملاکے بولوں!"

"آپ کا بادشاہ بہت عقل مند معلوم ہوتا ہے"۔ جمی نے کہا۔

"ہائیں! ہائیں!" وہ آدمی گھبرا کر بولا "حضور بادشاہ کو گالی کیوں
دیتے ہیں۔ اگر اس کے کسی جاسوس نے سُن لیا تو غضب ہو جائے گا۔"

"معاف کیجئے، غلطی ہوئی"۔ جمی بولا "میرا مطلب ہے، میرا مطلب
نہیں ہے۔ مجھے مت معاف کیجئے، مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی!"

"اب ٹھیک ہے"۔ وزیر خوش ہو کر بولا۔

"آپ کوشش کریں گے تو جھوٹ بولنا سیکھ جائیں گے"۔

وزیر خارجہ کے اصرار پر بچے بادشاہ کے محل کو روانہ ہوئے۔ راستے
میں انھوں نے وزیر خارجہ کو منا لیا۔ چوں کہ انھیں جھوٹ بولنے کی عادت
نہیں ہے، اس لئے ان کے لئے سچ بولنے کے راشن کارڈ بنوا دیئے جائیں۔
وزیر بولا: "بدنصیبوں کے لئے اس کی ضرورت نہیں ہے بلکہ بدنصیبوں سے

توہم یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ ہم سے سچ ہی بولتے رہیں۔ چاہے ہم ان سے کتنا ہی جھوٹ کیوں نہ بولیں۔"

"اسی کا نام ڈپلومیسی ہے!" جمی نے مسکرا کر کہا۔

"بے شک! بے شک!" وزیر نے سر ہلا کر کہا: "وہ میں کر دوں گا۔"

وزیر خارجہ نے وعدہ کیا: "مگر آپ اتنا وعدہ تو کیجئے کہ کم سے کم ہمارے بادشاہ کے سامنے آپ سچ نہیں بولیں گے کیوں کہ ہمارے بادشاہ جھوٹ بہت پسند کرتے ہیں۔"

ناز بولی: "وعدہ کرتے ہیں!"

عرفی فوراً چمک کر بولا: "واہ کیسے وعدہ کرتے ہیں؟ تم تو ہو ہی جھوٹی تمھارے لئے وعدہ کرنا کیا مشکل ہے۔"

ناز عرفی کو چانٹا مارنے ہی والی تھی کہ تتلی نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ اور بچے آگے چلے گئے۔

پیارے بچو! میں کیا حال بیان کروں بادشاہ دروغ گو کے دربار کا۔ وہ اتنا بڑا دربار تھا کہ دروازے میں داخل ہو کر بادشاہ سلامت کے قدموں تک پہنچنے میں ایک گھنٹا صرف ہوتا تھا۔ بادشاہ اور درباری ایک دوسرے سے مائیکروفون پر بات کرتے تھے۔ بادشاہ سلامت نے بہت عمدہ لباس پہن رکھا تھا لیکن درباریوں کے کپڑے پھٹے نظر آرہے تھے۔ جھوٹ نگر کے بادشاہ سلامت کا حکم تھا کہ ان کی ریاست میں کوئی ان کے سوا اچھے کپڑے نہ پہنے ورنہ بادشاہ میں اور ان کی رعایا میں کیا فرق رہ جائے گا۔ اسی طرح رعایا کو نہ صرف اچھے کپڑے پہننے بلکہ اچھا کھانے اچھا مکان بنانے اور اچھا سوچنے تک کی بھی اجازت نہ تھی۔ اس دربار کی چھت اتنی اونچی تھی کہ اگر دربار کی چھت پر نگاہ کرو تو پگڑی سر سے نیچے گر پڑتی تھی۔ اس دربار میں اتنے فانوس تھے جتنے آسمان پر تارے ہیں۔ بادشاہ کا تخت زمرد کا بنا ہوا تھا۔ اور جب زمین کے نیچے بادشاہ کے دربار میں پہنچے تو اس وقت بادشاہ ایک درباری کے کوڑے لگا رہا تھا۔ اور درباری سے پوچھ رہا تھا۔

"درد تو نہیں ہوتا۔"

اور درباری جس کی پیٹھ کوڑے کھا کھا کر لہو لہان ہو رہی تھی برابر کہے جا رہا تھا: "آہاہاہا۔ حضور اور مارتے جایئے اور مارتے جایئے حضور، بے حد مزا آرہا ہے۔

دربار میں سولی لگی ہوئی تھی۔ وہاں پر ایک درباری شاعر سولی پر چڑھا ہوا بادشاہ کی شان میں ایک قصیدہ پڑھ رہا تھا۔

جب بچے دربار کے اندر آئے تو چاروں طرف سے درباری کہنے لگے "لعنت ہو تم پر زمین کے باشندو!"

"تم پر بھی لعنت ہو جھوٹ نگر کے باسیو!" عرفی نے جواب دیا۔

پھر وزیر خارجہ نے سر جھکا کر بادشاہ سے کہا: "اے ظالم دروغ گو بادشاہ! کرۂ زمین کے باسی تیری خدمت میں حاضر ہیں۔"

دروغ گو بادشاہ نے بچوں کی طرف بڑے غور سے دیکھا۔ پھر بولا۔ "بڑے بدصورت بچے ہیں!"

عرفی یہ تعریف سن کر کورنش بجا لایا اور بولا: "بدصورتی تو آپ پر ختم ہے۔"

جمی نے کہا: "بادشاہ سلامت کے چہرے پر تھوکنے کو جی چاہتا ہے۔ حالاں کہ بزرگوں نے کہا ہے چاند کا تھوکا اپنے منہ پر ہی پڑتا ہے۔"

"جن لوگوں نے یہ بات کہی ہے وہ بڑے نامعقول تھے۔"

بادشاہ سلامت نے سر ہلا کر کہا اور پھر مسکرا کر وزیر سے بولے: "انھیں محل کے باہر کھڑا کر کے بھوکا مار دو۔"

موہنی گھبرا گئی۔ اس نے آہستہ سے وزیر سے پوچھا۔ "وزیر صاحب کیا واقعی آپ ہمیں محل کے باہر کھڑا کر کے بھوکا مار دیں گے؟"

"اس کا مطلب ہے۔" وزیر نے جواب دیا: "بادشاہ سلامت نے فرمایا ہے انھیں محل کے اندر لے جا کے خوب کھانا کھلاؤ۔"

"شکریہ!" عرفی بادشاہ سلامت کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ پھر گھبرا کر بولا۔ "میرا مطلب بالکل شکریہ نہیں! ہم جاتے ہیں۔ اے میرا مطلب ہے ابھی حاضر ہوتے ہیں"

"مگر یہ تو بالکل حیدرآبادی زبان ہے!" موہنی چمک کر بولی۔

"وہاں بھی تو یہی کہتے ہیں۔ حیدرآباد میں جب رخصت ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ابھی حاضر ہوتا ہوں!"

وزیر خارجہ مسکرا کر بولا: "ہمارا کوئی بزرگ پہنچا ہوگا اس علاقے میں! چلیے آپ کو محل دکھا لاؤں!"

بادشاہ کا محل بڑا خوب صورت۔ در و دیوار نیلم پتھر سے تراشے گئے تھے۔ جگہ جگہ سونے چاندی کے ستون کھڑے تھے۔ محل کی برجیاں اور گنبد اور مینار یاقوت لعل اور مرجان کے تھے۔ پائیں باغ میں بڑے خوب صورت درخت تھے اور ان پر خوب صورت پرندے بیٹھے ہوئے چہک رہے تھے۔ لان کی ہری ہری گھاس میں ایک سفید کتا بچوں کو دیکھ کر بھونکنے لگا۔ بڑا ہی پیارا کتا تھا۔ موہنی کو کتے بہت پسند تھے۔ اس سے نہ رہا گیا۔ دوڑی دوڑی اس کتے کے پاس گئی اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب کتا دم ہلانے لگا تو موہنی نے کتے کو اپنی گود میں لینا چاہا۔ مگر کتا اس کی گود میں نہیں آیا

جب اس نے غور سے دیکھا تو اس کتے کے پاؤں زمین میں گڑے ہوئے دکھائی دیئے۔

"یہ کتا تو زمین میں گڑا ہوا ہے۔" موہنی گھبرا کے بولی۔

وزیر نے بتایا "گڑا ہوا نہیں اُگا ہوا ہے۔"

"ہائیں!" نازو دوڑ کے کتے کے پاس جا کے دیکھنے لگی۔ واقعی کتے کے چاروں پاؤں اُگے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

وزیر نے سمجھایا "ہمارے ہاں گائے بیل، بھیڑ بکری سب جانور زمین سے اُگتے ہیں۔ نہ صرف جانور بلکہ پرندے بھی۔ آپ نے اس چڑیا کو دیکھا، کب سے اس شاخ پر بیٹھی ہوئی چہک رہی ہے، لیکن ایک بار بھی نہیں اُڑی!"

"ہاں واقعی!" جمی نے غور کیا۔

"یہ چڑیا درخت پر اُگی ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں درختوں میں پھل نہیں لگتے چڑیاں اُگتی ہیں۔ کوئی بلبل کا درخت ہے۔ اس پر صرف بلبل اُگتے ہیں۔ کوئی کوے کا پیڑ ہے وہاں صرف کوّے اُگتے ہیں۔ اسی طرح مور کا پیڑ ہے۔ وہ دیکھئے مور کا پیڑ۔"

واقعی عجیب و غریب دُنیا تھی یہ۔ یہاں جانور زمین پر لگتے تھے اور پرندے درختوں سے لٹکتے تھے۔ یہاں نہ کوئی جانور چل سکتا تھا۔ نہ کوئی پرندہ اُڑ سکتا تھا۔ ہاں اُن جانوروں اور پرندوں کی شکل بالکل ہماری زمین کے جانوروں اور پرندوں کی طرح تھی۔ بس یہی فرق تھا کہ یہ جانور یا تو زمین پر اُگے ہوئے تھے یا پھلوں کی طرح پرندے شاخوں پر لدے ہوئے تھے۔ باغ میں ایک جگہ دو تین گائیں اُگی ہوئی تھیں اور دودھ دوہنے والے

بڑے اطمینان سے دُودھ دُوھ رہے تھے "چاند کی گلئے اس لحاظ سے تو بہت اچھی ہے۔ دودھ دوہتے وقت لات نہیں مار سکتی۔"

"ہاں!" موہنی بولی "میرے خیال میں اس گلئے کی کاشت زمین پر بھی کی جانی چاہیئے۔"

"ہماری زمین پر تو پرندے اُڑتے ہیں!" جمّی نے وزیر سے کہا۔

وزیر حیرت سے بولا "آپ سچ کہہ رہے ہیں کہ جھوٹ؟"

"سچ!"

"ناممکن ہے!" وزیر نے جواب دیا "ناممکن ہے کہ پرندے اڑ سکیں، پرندے تو شاخوں پر لگتے ہیں۔"

"ہمارے ہاں تو جانور بھی چلتے ہیں۔ گلئے، بھینس، بکریاں سب زمین پر چلتی ہیں!" ناز بولی "ہم انسانوں کی طرح!"

وزیر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ خدا کے لئے اتنا جھوٹ تو نہ بولئے۔"

عرفی نے کہا "اور ہم لوگ کان سے نہیں منہ سے کھاتے ہیں۔"

"اوہو ہو!" وزیر ہنستے ہنستے بے دم ہونے لگا۔

"بھئی جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ منہ سے کھانا کھاتے ہو؟ ہاہاہا۔ ایسے میں تو مر جاؤں گا...... اتنا جھوٹ تو نہ بولو....... ہی ہی ہی.. ....میں بادشاہ کو بتاؤں گا کہ زمین کے باشندے تو چاند کے باشندوں سے بھی زیادہ جھوٹے ہیں!"

"یہ جھوٹ نہیں ہے جناب یہ بالکل سچ ہے۔" ناز خفا ہو کر بولی "ہم لوگ تمھاری طرح نہیں ہیں۔ ہم لوگ سچ بولنے کے عادی ہیں اور ہمارے ملک میں صرف سیاست داں جھوٹ بولتے ہیں!"

"صرف سیاست داں؟ ہو ہو ہو!! بس ناز اتنا تو جھوٹ نہ بولو۔ یعنی اتنا؟ یعنی ہم جھوٹوں کے سامنے بھی تم اتنا جھوٹ بولتی ہو۔ جھوٹ تو قانوناً ہر ایک کو بولنا پڑتا ہے۔ بادشاہ کے حکم سے!"

"لیکن ہمارے ہاں زمین پر کوئی ایسا قانون نہیں ہے جس کی رُو سے جھوٹ بولنا ضروری ہے۔"

وزیر نے سر ہلاتے ہوئے کہا "بڑے چالاک ہو تم لوگ، زمین کا اصل حال مجھے نہیں بتاتے۔ کتنا بڑا جھوٹ ہے یہ کہ تمھاری زمین پر جھوٹ بولنا قانوناً ضروری نہیں۔ ارے جھوٹ کے بغیر تو حکومت ایک دن نہیں کی جا سکتی۔ ہونہہ۔ کیا تم؟ کیا تمھاری زمین؟ کل تم کہو گی تمھاری زمین کے پھولوں پر لپ سٹک نہیں لگایا جاتا!"

"لپ سٹک؟" ناز حیرت سے بولی "لپ سٹک کا پھولوں سے کیا تعلق ہے؟"

"وہ دیکھو!" وزیر نے باغ کی ایک کیاری کی طرف اشارہ کیا۔ ان لوگوں نے مڑ کر دیکھا تو واقعی باغ کی ایک کیاری میں جہاں سفید پھول کھلے ہوئے تھے وہاں پر تین مالی ہاتھوں میں لپ سٹک لئے ہوئے پھولوں کو سُرخ کر رہے تھے۔ "یہ کیا ماجرا ہے؟" جمی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہمارے ہاں یہ دستور ہے۔" وزیر نے جواب دیا۔ "کہ جب سفید پھول بڑے ہوجاتے ہیں تو مالی ان پر لپ سٹک لگاتے ہیں۔"

مگر موہنی حیرت سے کہنے لگی۔ مگر ہمارے یہاں تو لپ سٹک پھول نہیں لگاتے، عورتیں لگاتی ہیں۔"

"عورتیں! لپ سٹک لگاتی ہیں!" وزیر خارجہ حیرت سے چکرا کر بولا "آپ تو جھوٹوں کی ملکہ چنی جا سکتی ہیں۔ دیکھیے!" اور اب وزیر خارجہ نے خفا ہونا شروع کیا، "دیکھیے آپ لوگ بے شک جھوٹ بولیے، مگر اتنا تو مت بولیے۔ میں آپ سے کم سے کم یہ توقع تو رکھتا ہوں کہ آپ مجھے کرہ زمین کا صحیح صحیح حال بتائیں گے۔"

"ہم بالکل صحیح کہہ رہے ہیں!"

"آپ بکواس کر رہے ہیں۔ کیا میں اتنا جاہل ہوں کہ ابھی تک یہ نہ سمجھ سکا کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے؟ آپ چاہتے ہیں کہ میں یقین کر لوں کہ زمین پر پھول نہیں بلکہ عورتیں لپ سٹک لگاتی ہیں! وہاں جانور نہیں اُگتے بلکہ انسانوں کی طرح چلتے ہیں؟ اور پرندے اُڑتے ہیں؟ اجی آپ نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟ احمق؟ جاہل؟ نالائق؟" مارے غصے کے وزیر کے ہونٹوں سے جھاگ بہنے لگا۔ اس نے زور سے تالی بجائی۔ اسی وقت دس بارہ ہٹے کٹے غلام رائفلیں لے کر حاضر ہو گئے۔

وزیر نے ان سے کہا: "یہ لوگ جھوٹ نگر میں ایک لمحے کے لئے بھی نہیں رکھے جا سکتے۔ ان کے طرز عمل سے ہماری بستی کے لوگوں کا اخلاق

خطرے میں ہے۔ اس لئے انھیں فوراً باندھ کر کسی کشتی میں ڈال کر دریا میں چھوڑ دو۔"

غلام بچوں کو گرفتار کرنے کے لئے آگے بڑھے۔ جمّی اور عرفی نے خوب جم کے لڑائی کی۔ جمّی نے اپنے فولادی مُکّوں سے کئی غلاموں کو گرایا۔ ناز، موہنی اور نیلی نے عرفی اور جمّی کی بہت مدد کی، مگر یہ لوگ آخر بچے تھے۔ پکڑے گئے۔ غلاموں نے ان سب کو رسیوں میں باندھا اور شہر سے باہر لے جاکر ایک کشتی میں ڈال کر اُسے دریا میں چھوڑ دیا۔ بچے بے بسی کی حالت میں کشتی کے اندر رسّوں سے بندھے ہوئے پڑے تھے۔ اور کشتی دریا کے طوفان اور بھنور میں گھومتی اور بہتی ہوئی چلی جا رہی تھی اور جھوٹ نگر بچوں کی نگاہ سے اوجھل ہو رہا تھا۔

بچّے کشتی میں بندھے پڑے تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو آزاد کرانے کی بہتیری کوشش کی مگر جھوٹ نگر کے غلاموں نے انھیں لوہے کے مضبوط رسّوں سے اس طرح جکڑ دیا تھا کہ جمّی جو لوہے کا بنا ہوا تھا وہ بھی اپنی پوری طاقت لگا لینے کے باوجود رہا نہ ہو سکا۔ تھک ہار کر بچّے کشتی میں پڑے رہے اور ندی کبھی دھیرے کبھی تیز بہتی رہی۔

صبح گزر گئی، دوپہر آنے لگی۔ سورج سر پر چمکنے لگا۔ موہنی اور ناز بھوک اور پیاس سے پریشان ہو کر رونے لگیں۔

موہنی بولی: "عرفی بھیا خواہ مخواہ ہمیں چاند میں لے آئے۔ ایک نگوڑی فاختہ کی خاطر۔"

نازبولی: "ہائے یہ دھوپ تو ہمیں جھلسا دے گی۔"
تتلی بولی: "ارے میں تو اپنے موتیوں کے شہر میں کیسے آرام سے تھی۔
ارے لوگو دیکھو میرا بدن جیسے بخار سے بھن رہا ہے۔"
"بخار نہیں جاہل لڑکی! یہ دھوپ کی گرمی ہے!" جمی آہستہ سے بولا
"جاہل تم۔ احمق تم!" تتلی نے فوراً غصّے میں آکے کہا۔
عرفی نے کہا: "آپس میں جھگڑنے سے کیا فائدہ، اب ہمیں اپنے آپ کو آزاد کرانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔"
"کیسے؟"
سب مل کر آواز دیں۔ ارے لوگو ہمیں بچاؤ! ہمیں بچاؤ! ہم ڈوبے جا رہے ہیں!" عرفی نے جواب دیا۔
تتلی بولی: "نوج۔ یہ تو چھوٹوں کا دیس ہے۔ یہاں ہماری بات کا یقین کون کرے گا۔
"تو ہم کہیں گے": جمی نے سوچ سوچ کر کہا۔
"ارے لوگو ہمیں مت بچاؤ۔ ہم پڑے مرنے میں ہیں۔"
نازبولی: "مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم لوگ چھوٹوں کے دیس سے باہر آگئے ہوں اور کوئی ہماری بات کا اعتبار تک نہ کرے۔"
عجیب مصیبت ہے!" موہنی روہانسی ہو کر بولی: "مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔"
عرفی نے کہا: "میں سمجھتا ہوں۔ ہم سب مل کے شور مچائیں کوئی نہ کوئی

اللہ کا بندہ تو ہماری مدد کو آئے گا۔"

بہت دیر تک بچے کشتی میں بیٹھے شور مچاتے رہے۔ مگر کوئی ان کی مدد کو نہ آیا۔ بچے چلاتے چلاتے خاموش ہو گئے۔ دھوپ بہت تیز ہو گئی۔ ندی کا پانی دھیرے دھیرے بہنے لگا۔ بچے بھوک اور پیاس سے بے ہوش ہونے لگے تھوڑی دیر میں عرفی کو آسمان میں ایک شاہین نظر آیا۔ جو اتنا بڑا تھا جیسے ہوائی جہاز۔

"ارے دیکھو کتنا بڑا عقاب ہے!" ناز حیرت اور خوف سے چلا اٹھی۔

شاہین چکر لگاتا ہوا آسمان سے نیچے اترنے لگا۔ کئی گز لمبی تو اس کی چونچ تھی اور سینکڑوں فیٹ تک اس کے پھیلے ہوئے پر تھے اور اس کے خوفناک پنجے کسی زہریلے ناک آہنی کرین کے شکنجے کی طرح نظر آرہے تھے۔ شاہین چکر لگاتے ہوئے کشتی کے سر پر آگیا۔ اب معلوم ہوا گویا کالی بدلی آسمان پر چھا گئی۔

"یا اللہ اب کیا ہوگا" ناز خوف سے بولی۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

شاہین نے ایک زور کا جھپٹا مارا اور اپنے پنجے میں کشتی کو ایک تنکے کی طرح اٹھا لیا۔ اب شاہین آسمان پر بہت بہت اوپر پرواز کر گیا۔ کشتی اس کے پنجے میں لٹک رہی تھی۔ بچے اسی کشتی میں سہمے ہوئے بیٹھے تھے وہاں سے وہ لوگ صرف شاہین کے پھیلے ہوئے سرمئی پر دیکھ سکتے تھے۔ اور اس کا غرور سے تنا ہوا سفید سینہ! شاہین کی آنکھیں اتنی بڑی تھیں جیسے گھڑا اور وہ آگ کی طرح سرخ نظر آتی تھیں۔

تِلی بولی: "مجھے تو اس کی آنکھوں سے بڑا ڈر لگتا ہے کیسی خوفناک آنکھیں ہیں اس کی۔"

جمی جو کشتی کے ایک کنارے بندھا ہوا تھا۔ اور اس لئے ذرا گردن موڑ کر نیچے دیکھ سکتا تھا۔ بولا: "اگر اس وقت شاہین کے پنجے سے ہماری کشتی چھوٹ جائے اور چاند کی زمین پر جا کے نہ صرف اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے بلکہ ہمارا ابھی انجر پنجر تک نہ ملے گا۔"

ابھی یہ بات جمی کے منہ میں ہی تھی کہ شاہین نے کشتی کو اپنے پنجے سے چھوڑ دیا۔ کشتی ڈگمگاتی چکر کھاتی اوپر نیچے ہوتی ہوئی بہت تیزی سے نیچے گرنے لگی۔ اگر وہ لوگ کشتی سے بندھے نہ ہوتے تو اب تک سب کے سب زمین پر گر کر مر گئے ہوتے۔ لیکن شاہین بہت تیز رفتار تھا۔ وہ بجلی کی تیزی سے نیچے گیا۔ اور پیشتر اس کے کہ کشتی زمین پر گرے اس نے اُسے پھر اپنے پنجے میں داب لیا۔ اور آسمان کی طرف پرواز کرنے لگا۔

بچوں کا سانس ہوا میں گویا اٹک گیا تھا۔ عرفی نے رُکتے رُکتے کہا "موت آگئی تھی۔"

جمی بولا: "میری تو بیڑی ڈاؤن ہو گئی تھی۔"

تِلی بولی: "مگر اس سے اس بات کا پتا چلتا ہے۔ یہ شاہین ذہین جانور ہے۔ ہماری بات سمجھتا ہے۔"

موہنی نے کہا: "جانے یہ موا ہمیں کدھر اڑائے لئے جا رہا ہے؟ یکایک بادلوں کی ایک گرج سی پیدا ہوئی۔ یہ شاہین بول رہا تھا۔

"میں آپ کو شہنشاہ عقاب کے حضور میں لے جا رہا ہوں"
سارا دن شاہین اس کشتی کو پنجے میں دبائے مغرب کی سمت پرواز کرتا رہا۔ اس کے اڑنے کی رفتار سات سو میل فی گھنٹے کے حساب سے کیا کم ہوگی۔ اس پورے سفر میں پل بھر کو بھی وہ کہیں نہ ٹھہرا۔ آخر جب شام ہوئی اور سورج مغرب کو جانے لگا تو شاہین نے اپنی رفتار کم کی۔ اور دھیرے دھیرے نیچے اترنا شروع کیا، عرنی نے جمی سے کہا: "تم کنارے پر بیٹھے ہوئے نیچے دیکھ کے بتاؤ ہم کہاں ہیں؟"

جمی نے نیچے دیکھ کر کہا: "یہ تو میں نہیں بتا سکتا کہ ہم کہاں ہیں، مگر نیچے ضرور اتر رہے ہیں۔ چاروں طرف بڑے خطرناک پہاڑ نظر آتے ہیں۔ جن کی عمودی چٹانوں پر بڑے بڑے عالی شان محل کھڑے ہیں۔ پہاڑوں سے نیچے ایک خوب صورت وادی ہے مگر اس وادی میں ایک بھی کھیت نہیں ہے۔ جدھر دیکھو جنگل ہی جنگل نظر آتا ہے۔ ہاں...... نہیں نہیں...... اب کھیت نظر آنے لگے۔ ارے یہاں تو نہریں بھی ہیں۔ اس کا مطلب ہے یہاں پر کھیتی باڑی کرنے والے لوگ رہتے ہوں گے"

اس کے بعد جمی کچھ بول نہ سکا۔ کیوں کہ اب شاہین بہت جلدی جلدی چکر کاٹ رہا تھا۔ اور کشتی ادھر ادھر اس کے پنجے میں ڈول رہی تھی۔ یکایک شاہین نے چونچ نیچی کر کے فضا میں ایک ڈبکی لگائی اور سائیں سائیں کرتا ہوا ایک بہت بڑے دروازے کے اندر سے گویا تیرتا ہوا نکل گیا۔ اور سیدھے ایک تخت کے نیچے جا کے رک گیا اور آہستہ سے کشتی کو چھوڑ دیا۔ کشتی گرتے گرتے

ایک چٹان سے ٹکرائی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ لکڑی کی کشتی تھی اس کے ٹکڑے ہوتے ہی لوہے کی زنجیریں ڈھیلی ہو گئیں اور بچے کسمساتے ہوئے اس میں سے باہر نکل آئے اور ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ سامنے ایک بہت اونچی تخت نما چٹان پر ایک خوفناک عقاب بیٹھا تھا وزن اور جسامت میں شاہین سے دُگنا تگنا معلوم ہو رہا تھا۔ اُس تخت کے پیچھے شاہی جھنڈا لہرا رہا تھا۔ جس پر بڑے بڑے حرفوں میں لکھا تھا۔

" تو شاہین ہے بسیرا کر چٹانوں پر "

شاہین نے بچوں سے کہا: " با ادب با ملاحظہ ہوشیار! شہنشاہ عقاب تخت پر جلوہ افروز ہیں۔ جھک کر کورنش بجا لاؤ۔"

بچے مودب ہو کر آداب بجا لائے!

شہنشاہ عقاب پتھر کی ایک بہت بڑی تپائی پر ایک بہت بڑی طشتری میں کچھ رکھے ہوئے تھا اور بار بار طشتری کی طرف جھک کر چونچ سے ٹونگتا جاتا تھا۔ طشتری میں مکھیوں کے بھنبھنانے کی سی آواز پیدا ہو رہی تھی۔

" طشتری میں کیا ہے؟ " موہنی نے ذرا دلچسپی سے پوچھا۔

شہنشاہ عقاب زور سے ہنسا اس نے اپنی چونچ بڑھا کر عرفی کو ٹھونگ لیا پھر اسے پتھر کی بڑی طشتری میں لے جا کر چھوڑ دیا۔

عرفی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس طشتری میں پچاس ساٹھ انسان ہوں گے انسان تو نہ تھے۔ انسان نما جانور تھے۔ جن کا قد مشکل سے دس انچ ہوگا۔ مگر شکل و صورت اور حلیے میں بالکل انسان دکھائی دیتے تھے۔ وہی آنکھیں، وہی بال وہی باہیں، وہی ٹانگیں!

خوف اور حیرت سے عرفی کی گھگھی بندھ گئی، کچھ دیر تک وہ انھیں آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہا۔ آخر اس سے رہا نہ گیا۔ بولا: "آپ انسان ہیں؟"

وہ لوگ بھی اسے غور سے دیکھتے رہے۔ آخر ان میں سے ایک آدمی جو شکل وصورت سے بڈھا معلوم ہوتا تھا۔ بڑے اداس لہجے میں بولا۔

"ہاں کبھی ہم بھی انسان تھے!"

"مگر آپ کی یہ حالت کیسے ہوگئی؟ اس قدر چھوٹا قد آپ کا کیسے ہوگیا یا شروع ہی سے آپ لوگ ایسے تھے؟"

"نہیں بھائی!" وہ بڈھا بولا: "کبھی ہم بھی تمھاری ہی طرح قدآور انسان تھے۔ یہ ساری وادی ہماری تھی۔ اس ملک پر ہمارا راج تھا۔ مگر......"

اس کے آگے وہ بڈھا کچھ نہ کہہ سکا۔ کیوں کہ عقاب نے اُسے اپنی چونچ میں ٹھونگ کر ثابت و سالم ہی نگل لیا۔ اس کے بعد اس چونچ سے شہنشاہ عقاب نے عرفی کو طشتری سے اٹھا کر واپس بچوں میں رکھ دیا۔ ناز تو خوف سے چیخ ہی پڑی تھی۔ اس کا خیال تھا عرفی کو عقاب کھا جائے گا۔"

شہنشاہ نے شاہین سے پوچھا: "یہ انسان تمھیں کہاں سے ملے۔ یہ تو ہمارے دیس کے انسان نہیں معلوم ہوتے، یہ تو بڑے موٹے تلنگے انسان ہیں، اور ان میں کچھ عورتیں بھی ہیں۔"

شاہین بولا: "حضور میں سرحد پر اُڑ رہا تھا کہ چھوٹوں کے ملک سے جو ندی بہتی ہوئی سمندر کو جاتی ہے اس ندی میں ایک بہتی ہوئی کشتی میں یہ لوگ بندھے پڑے تھے۔"

شہنشاہ نے پوچھا: "تم لوگ کہاں سے آئے ہو؟"

عرفی نے کہا: "زمین کے سیارے سے"

"اچھا! اچھا! سمجھ گیا" شہنشاہ عقاب بولا "یہ زمین جو ہمارے چاند کے گرد طواف کرتی ہے"

جمی نے کہا: "زمین نہیں چاند، ہماری زمین کے گرد طواف کرتا ہے"

"کیا بکتے ہو؟" عقاب غصے سے بولا "تمھاری زمین تو بس اتنی سی ہے جتنا ایک بڑا گولا۔ وہ ہمارے چاند کا کیا مقابلہ کر سکتی ہے۔ چاند تو زمین سے بہت بڑا ہے"

"چاند نہیں زمین بڑی ہے"

"نہیں ہمارا چاند بڑا ہے۔ صاف بڑا معلوم ہوتا ہے۔ ارے تم اس ذلیل زمین کے رہنے والے ہو جسے ہر سال گرہن لگتا ہے"

"اجی جناب!" موہنی انگلیاں نچا کے بولی "ہماری زمین کو نہیں آپ کے چاند کو ہر سال گرہن لگتا ہے"

"زیادہ بڑھ بڑھ کے بات کرو گی تو کھا جاؤں گا"

عقاب نے اپنی چونچ کھولی اور موہنی کی آنکھوں کے سامنے ایک کنواں سا کھل گیا۔ جس کی تاریکی میں ایک سُرخ سُرخ کئی گز لمبی زبان موہنی کے خون کی پیاس معلوم ہوتی تھی۔ موہنی ڈر کے مارے پیچھے ہٹ گئی۔

شہنشاہ عقاب نے شاہین سے کہا، "انھیں لے جا کے جیل میں بند کر دو صبح ناشتے پر ہم انھیں کھائیں گے۔ میں مردوں کو کھاؤں گا۔ ملکہ شاہینہ

عورتوں کو کھائیں گی۔ کل صبح ناشتے پر ہم انھیں بتائیں گے کہ زمین بڑی ہے یا چاند۔ انسان بڑا ہے یا عقاب؟ ہا ہا ہا"

اس کے بعد شہنشاہ عقاب نے جو اپنی چونچ چلائی تو چند لمحوں ہی میں اس نے انسانوں سے بھری ہوئی طشتری کو خالی کر دیا، اور اڑ کر اپنے محل میں چلا گیا۔

شہنشاہ کے جانے کے بعد شاہین نے چند انسان نما بالشتیوں کو حکم دیا کہ وہ ان زمین کے انسانوں کو لے جا کر شاہی جیل خانے میں بند کر دیں۔

تھوڑی دیر میں لکڑی کی ایک بہت بڑی بند گاڑی آئی۔ جس کے آگے کئی سو بالشتیے انسان گھوڑوں کی طرح جتے ہوئے تھے۔ شاہین نے عرفی، بناز، موہنی، تیلی، جمی سب کو باری باری سے اپنی چونچ میں اٹھا کر بند گاڑی کا دروازہ کھول کر اس میں رکھا اور پھر دروازہ بند کر دیا۔ ایک شاہین بچہ کوڑے مار مار کر گاڑی چلانے لگا۔ اور بالشتیے انسان گاڑی دھکیلتے ہوئے اسے جیل خانے کی طرف لے گئے۔

رات بھر بچوں کو جیل خانے میں نیند نہیں آئی اور آتی بھی کیسے؟ صبح انھیں ناشتے پر اپنی موت دکھائی دے رہی تھی۔ جیل کا بالشتیا چوکیدار ان کے کھانے کے لئے بہت سی گھاس چھوڑ گیا تھا۔ پہلے تو بچوں کو خیال تک نہ آیا کہ یہ گھاس ان کے لئے ہے۔ لیکن جب انھوں نے ایک بالشتیے قیدی کو جو ان کے کمرے میں قید تھا گھاس کھاتے دیکھا تو حیران ہو کر بولے "تم لوگ انسان ہو کر گھاس کھاتے ہو؟"

" اور کیا کھائیں؟" وہ بالشتیا حیرت سے بولا۔

" روٹی کھاؤ؟"

" روٹی؟ روٹی کیا ہوتی ہے؟"

اس بالشتئے کے قریب ایک بوڑھا سفید داڑھی والا بیٹھا تھا، روٹی کا نام سُن کر وہ چونک پڑا۔ اس کا سارا جسم کانپنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ عرفی، جمی، موہنی، نازیہ نے اسے بہت ڈھارس دی۔ اس سے اس کے رونے کی وجہ پوچھی۔ بوڑھے نے کہا،

"یہ بڑی عبرت ناک داستان ہے۔ مگر تمھیں اس لئے سناتا ہوں کہ شاید تم لوگ کسی طرح اس ظالم عقاب کے پنجوں سے بچ کر اپنے سیارے کو لوٹ سکو۔ اور وہاں کے رہنے والوں کو نصیحت کر سکو۔

پیارے دوستو! کبھی ہم بالشتئے انسان بھی تمھاری طرح پورے قد کے انسان تھے۔ کبھی ہم بھی آزاد تھے۔ اس وادی میں ہر طرف آزادی ہی آزادی تھی آزادی اور حکومت، انصاف اور سچائی کا یہاں پر راج تھا۔ اس وادی میں تمام انسان ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی بھلائی کے لیے جیتے تھے۔ ہماری وادی میں قتل ڈاکا، چوری کا نام و نشان نہ تھا۔ اس وادی کی زمین بہت زرخیز ہے۔ اس لئے ہر شخص کو پیٹ بھر کھانے کو مل جاتا تھا۔ اس لئے کوئی کسی کو دیکھ کر جلتا نہ تھا۔ ہماری حکومت کے پاس کوئی فوج نہ تھی اور چوں کہ فوج نہ تھی اس لئے ہتھیار بھی نہ تھے۔ پانچ ہزار سال تک اسی طرح ہماری قوم کھیتی باڑی کرتی رہی

اور آرام اور چین سے رہتی رہی۔

پھر کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ہمارے ملک میں دو جانور آئے۔ ایک اپنے آپ کو عقاب کہتا تھا دوسرا شاہین۔ یہ دونوں بڑے خونخوار جانور تھے اور ہر وقت لڑتے رہتے تھے۔ اس سے پہلے ہماری وادی میں کسی نے شاہین اور عقاب کو نہ دیکھا تھا۔ اس لئے ہم نے ذرا بڑی قسم کی چڑیا سمجھ کر ان کے سامنے اناج ڈالا تو انھوں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اور بولے "ہم شاہین بچے ہیں۔ ہم اپنا شکار خود کرتے ہیں"۔ اس کے بعد یہ دونوں اوپر اٹھ گئے۔ آسمان میں چکر لگاتے رہے، آخر ایک جھپٹا مار کر عقاب نے انسان کے ایک بچے کو پنجے میں اٹھا لیا جسے پیدا ہوئے ابھی دو دن ہوئے تھے۔ اور اسے اپنی چونچ سے نوچ کر کھا گیا۔

شاہین نے بھی ایسا ہی کیا، ان کی اس جرأت اور بہادری کو دیکھ کر ہمارے نوجوانوں کے دلوں پر بہت اثر ہوا، اور ساری قوم دو قبیلوں میں بٹ گئی۔ ایک قبیلہ عقاب کی پرستش کرنے لگا۔ دوسرا شاہین کی۔ آپس میں لڑائی جھگڑے خوں ریزیاں بڑھتی گئیں۔ زمینوں پر، درختوں پر، کھیتوں پر ہوا اور پانی پر جھگڑے بڑھتے بڑھتے خوفناک جنگلوں کی صورت اختیار کر گئے پانچ ہزار برس اس وادی میں لڑائیاں ہوتی رہیں۔ اس عرصے میں ہم برابر عقاب یا شاہین کی پرستش کرتے رہے اور انھیں مقدس جان کر پالتے رہے ہم لڑائی کے غلاموں کا خون اور گوشت ان کی نذر کرتے رہے۔ عقاب اور شاہین انھیں کھا کھا کر مضبوط، موٹے اور خونخوار ہوتے گئے، آخر ایک روز وہ آگیا۔ جب

عقاب اور شاہین کی نسل نے انسان کو نیچے دبا لیا۔ اُس دن سے اس وادی میں عقاب اور شاہین کا راج ہے۔ یہ لوگ ہمیں پالتے ہیں اور کھاتے ہیں۔ انسانی نسل کمزور ہوتے ہوتے بالشتیوں سے بھی گھٹتی جا رہی ہے۔ ہم لوگ اب کھیتی باڑی نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ عقاب ہمیں آکر کھیتوں سے اپنی چونچ میں دبا کر کھا جاتے ہیں۔ ساری وادی پر ایک گھنا جنگل اُگ آیا ہے اور ہم اس کی لانبی لانبی گھاس میں چھپ کر اپنی جان بچاتے پھرتے ہیں۔ اور کل صبح ناشتہ پر میری باری ہے"

بڈھا خوف سے رونے لگا۔ یہ کہانی سُن کر موہنی، ناز، اور تیلی کا جی بھر آیا۔ وہ بھی رونے لگیں۔

جمی نے کہا: "مگر شاہین کا کام تو کبوتروں پر جھپٹنا تھا!"

عرفی بولا: "بھئی جب کبوتروں پر جھپٹنے میں مزا نہ رہے تو انسانوں کی باری آجاتی ہے۔ اور اگر مزا جھپٹنے ہی میں ہے تو یہ جھپٹنا کبوتروں تک ہی کیوں محدود رہے؟"

"تمہاری عقل مندی بے موقع ہے یہاں!" وہ بڈھا عرفی سے کہنے لگا۔ "کل صبح تم بھی عقاب کے ناشتے میں ہوگے!"

"دعا کیجیے بڑے بھائی!" جمی بولا "ہم معصوم بچے ہیں۔ ہم تو ایک چھوٹی سی فاختہ کی تلاش میں آئے ہیں یہاں! اور ہم کسی کا بُرا نہیں چاہتے۔ اس لیے ہمارا بُرا کوئی کیوں چاہے گا؟"

"اور اگر کوئی چاہے؟" بڈھے نے پوچھا۔

"تو وہ اپنے کیے کی سزا پائے گا۔" جمی نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا،

اور اس کے ہاتھوں کی انگلیاں فولادی مُگّے میں بدل گئیں۔

بچوں کی وہ رات نہ سوتے کٹی نہ جاگتے کچھ عجیب سی کیفیت تھی اس پر جمّی نے سوچ سوچ کر بچوں کو کام پر لگا دیا۔ جس جیل خانے کے کمرے میں وہ قید تھے اس کی دیواروں پر بہت سے رسّے لٹکے ہوئے تھے۔ جن پر قیدیوں کو باندھ کر پیٹا جاتا تھا۔ جمّی نے یہ سب رسّے دیواروں پر سے اُتر والئے اور انھیں جوڑ کر ایک لمبا رسّا تیار کرالیا۔ جب یہ رسّا تیار ہوچکا۔ تو جمّی نے ہر ایک سے کہا کہ وہ باری باری چند گز کا فاصلہ چھوڑ کر اس رسّے کو اپنی کمر کے گرد لپیٹ لیں اور گانٹھ لگا لیں رسّے کے شروع ہی میں سب سے پہلے جمّی آیا۔ اس کے بعد نازؔ، پھر موہنی پھر بیلی اور سب سے آخر میں عُرفی۔ جب سب بچّے باری باری سے ایک ہی رسّے میں بندھ گئے تو جمّی نے سب کو آرام سے سوجانے کو کہا۔ مگر یہاں نیند کس کو آتی تھی۔ عقاب کی تیز اور جان لیوا چونچ ہر وقت آنکھوں کے آگے گھومتی تھی۔

جب صبح ہوئی اور سورج نمودار ہوا تو جیل خانے کا دروازہ کھُلا اور بچوں کو واپس اسی لکڑی کی گاڑی میں سوار کرکے عقاب کے سامنے ایک بڑی طشتری میں رکھ دیا گیا۔

عقاب نے ہنس کر جمّی سے پوچھا: "رات کیسی کٹی؟"

جمّی نے بڑے اطمینان سے جواب دیا: "ہم لوگ بڑے آرام سے سوئے۔"

عقاب نے ہنس کر کہا: "ابھی تھوڑی دیر میں آپ ہمیشہ کے لئے سوجائیں گے۔"

"ہم آپ کو امن کا سندیسہ دینے آئے ہیں۔ آپ بہت بڑے عقاب ہیں

یہ آپ کو زیب نہیں دیتا کہ غریب انسانوں پر ظلم کریں۔

عقاب نے کہا: "جب ایک طاقت ور ایک کمزور پر غلبہ پاتا ہے تو اس میں کسی طرح ظلم کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ دنیا اسی طرح چلتی ہے۔"

جمی نے کہا: "دنیا کسی دوسرے طریقے سے بھی چل سکتی ہے اور زیادہ بہتر طریقے سے چل سکتی ہے۔"

عقاب نے چونچ میں جمی کو اٹھا لیا۔ جمی کے ساتھ ساتھ دوسرے بچے بھی رسی میں بندھے ہوئے لٹکے ہوئے نظر آئے۔

عقاب نے پوچھا: "یہ رسہ کیوں باندھ رکھا ہے؟"

جمی نے کہا: "بس یہی سوچا کہ جب تک جئیں ساتھ جئیں۔ جب مریں تو ساتھ مریں۔"

عقاب نے چونچ سے ایک جھٹکا دیا تو جمی اس کی چونچ کے اندر چلا گیا جمی نے اندر جاتے ہی اپنے دونوں آہنی بازو پھیلا دیئے اور دوسرے جھٹکے میں ناتہ، موہنی اندر آ گئیں۔ تیسرے جھٹکے میں تیلی اور عرفی، اب سب بچے چونچ کے اندر تھے۔ لیکن جمی نے چونکہ اپنے آہنی ہاتھ پھیلا رکھے تھے اس لئے عقاب کو بچوں کے نگلنے میں تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ جمی نے کہا: "جلدی سے میری بات سن لو۔ عقاب کی چونچ سے باہر ہم مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن عقاب کا مقابلہ اب ہم اس (منہ سے) کر سکتے ہیں۔"

"وہ کیسے؟"

جمی نے کہا: "عقاب ہمیں نگلنے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔ اس کی چونچ کی

ہڈی فولاد کی طرح سخت ہے۔ اس نے ہمیں اگر اپنی چونچ میں دبا کر پیس دیا تو ہم یہیں مر جائیں گے، اس لئے آپ لوگ میرے پیچھے پیچھے آیئے۔ جوں ہی میں اپنا ہاتھ چھوڑ دوں گا عقاب اپنی چونچ چلائے گا۔ اس لمحے ہم لوگ اس کے معدے کی نالی میں کود جائیں گے۔"

"ایک دو تین۔" کہہ کر جمی نے اپنے ہاتھ چھوڑ دیئے اور رسّے کو زور سے جھٹک کر معدے کی نالی میں کود گیا۔ رسّی کے جھٹکے سے ناز، موہنی، تیلی اور عرفی سب نالی میں کود گئے۔

چند لمحوں تک انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی غار کے اندر کود گئے ہیں۔ کسی گہرے کنوئیں میں چھلانگ لگا گئے ہوں۔ چند لمحوں تک تو ان کے قدم کہیں نہ لگے۔ پھر انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی گہری جھیل میں گر گئے ہوں۔

جمی نے تیرتے ہوئے کہا: "یہ عقاب کا معدہ ہے، میں اسے اپنی فولادی انگلیوں سے پھاڑ دیتا ہوں۔"

"ہائے ہائے!" عقاب چلّایا۔ "یہ میرے معدے میں کیا ہو رہا ہے؟" مارے درد کے وہ لوٹ پوٹ ہونے لگا۔

معدے کے اندر نیچے اوپر تلے ہونے لگے۔ لیکن جمی بڑی محنت سے اپنا کام کرتا رہا۔ تیلی بھی تلبنے کی تھی۔ بڑی جرأت سے اس کا ہاتھ بٹاتی رہی۔ جمی اور تیلی نے مل کر معدے کو پھاڑ دیا۔ اور عقاب کے دل کے اندر ہی اندر سے ٹکڑے کر ڈالے۔ اور اس کے اندر کے گوشت اور جھلیوں کو چیرتے ہوئے

عقاب کے جسم سے باہر آگئے، ان کی آنکھوں کے سامنے عقاب تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

جمی نے کہا: "ہر ظالم اوپر سے بہت مضبوط دکھائی دیتا ہے لیکن اندر سے بڑا کم زور ہوتا ہے۔"

پھر جمی نے شاہین سے کہا: "کیا خیال ہے آپ ہمیں کھائیں گے؟"

شاہین جو حیرت سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا، چپ چاپ چونچ کھولے جمی کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں خوف کی جھلک پیدا ہوئی جب اس نے اپنے بادشاہ عقاب کی لاش دیکھی تو اس نے اپنی چونچ نیچے گرا لی اور بچوں کی طرف پیٹھ کر لی۔

جمی نے کہا: "نہیں نہیں آپ ہمیں کھا لیجیے۔ ہم حاضر ہیں۔"

شاہین نے اپنے پر کھولے اور کہا اب میں جاتا ہوں، اب میں یہاں کبھی نہ آؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ ہوا میں اڑ گیا اور بہت جلد نظروں سے غائب ہو گیا، ساری وادی میں عقابوں کی شکست کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی، جنگل جنگل جہاں جہاں انسان چھپے بیٹھے تھے آزادی کا نعرہ لگاتے ہوئے باہر نکل آئے اور بچوں کا شکریہ ادا کرنے لگے۔ جیل خانوں کے دروازے کھول دیے گئے۔

———— اور کھیتوں میں جہاں سالہا سال سے گیہوں کا ایک دانہ نہ بویا گیا تھا وہاں پھر سے ہل چلنے لگے۔

بڈھے نے جمی اور بچوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: "غلامی نے ہمیں بونا بنا دیا تھا۔ لیکن بہت جلد ہم لوگ پھر سے انسانوں کا قد حاصل کر سکیں گے۔"

سات دن تک وادی میں آزادی کا جشن رہا۔ سات دن تک بچے اس وادی کے مہمان رہے۔ سات دن کے بعد عرفی نے اس بڈھے سے پوچھا: "اب ہمیں اجازت دیجیے۔ ہم تو یہاں امن کی فاختہ کی تلاش میں آئے تھے۔ آپ کو معلوم ہے وہ کہاں ہو گی۔ آپ کی وادی میں کسی نے اسے دیکھا ہے؟"

بڈھے نے کہا "ایک فاختہ آئی تو تھی اس کا گیت خوب صورت تھا اور اداس تھا اور جب ہم نے اس کی آواز سنی تو ہماری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور ہمارے دل میں اس زمانے کی تصویر آئی جب ہم آزاد تھے۔ وہ ایک رات ہمارے جیل خانے میں بھی آئی تھی۔ کیوں کہ اس کے لئے کہیں پر کوئی دیوار نہیں ہے اور کوئی دروازہ اس کے لئے بند نہیں ہے۔ اور ہم نے رو رو کر اس سے رک جانے کے لئے کہا۔ لیکن وہ نہیں رکی۔ اس نے کہا کہ تمھاری وادی میں ظلم اور جنگ کا راج ہے اور جہاں ظلم اور غلامی ہو وہاں میں نہیں رہ سکتی!" اس لئے وہ یہاں نہیں رکی اور جنوب کی سمت پرواز کر گئی۔"

جنوب کی طرف کون سا دیس ہے؟" عرفی نے پوچھا "جنوب کی طرف مت جاؤ۔" بڈھے نے گھبرا کر کہا "جنوب میں کہتے ہیں جادوگروں کا راج ہے جو ہر آنے والے کو منتر پڑھ کر پتھر بنا دیتے ہیں وہاں جو گیا آج تک واپس نہیں آیا۔"

عرفی نے کہا "اگر فاختہ ادھر گئی ہے تو ہم بھی جائیں گے! جس کام کے لئے گھر سے نکلے ہیں اسے پورا کر کے رہیں گے۔"

جب بچے کسی طرح نہیں مانے اور بڈھے کے سمجھانے کے باوجود انھوں نے فاختہ کی تلاش میں جادوگروں کے دیس میں جانے کی ٹھان لی تو عقاب وادی کے لوگوں نے ہماری زمین کے بچوں کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ جنھوں نے زمین سے چاند میں آکے وہاں کے لوگوں کو غلامی

سے نجات دلائی تھی۔ انھوں نے اپنے مہمانوں کو اپنی ریاست کی سرحد تک پہنچانے کے لئے سات گھوڑوں والے رتھ تیار کئے اور ان میں کھانے کا بہت سا سامان رکھا اور بچوں کو بہت سے تحفے تحائف دے کر اپنے ہاں سے رخصت کیا۔

رتھ پانچ دن اور پانچ رات عقاب وادی میں سے گزرتے رہے۔ آخر سرحد آگئی۔ سرحد پر آکر رتھ رک گئے۔ یہاں پر عقاب وادی ختم ہو جاتی تھی۔ اور وادی کے ساتھ ساتھ سرسبزی اور شادابی بھی۔ اب بچوں کے سامنے لق و دق صحرا تھا۔ جس کا دوسرا کنارا نظر نہ آتا تھا۔ لیکن اس صحرا میں مٹی اور ریت نہ تھی۔ چاروں طرف جدھر نظر جاتی تھی۔ چاندی کی ریت ہی نظر آتی تھی۔ موہنی نے اپنی مٹھی میں ریت بھر کے سب کو دکھایا اور خوشی سے چلا کے بولی "یہ تو چاندی کی ریت ہے! دیکھو!!"

عرفی نے پوچھا "اس جگہ کو کیا کہتے ہیں؟"

بڈھے رتھ بان نے کہا "یہ صحرا ماہتاب ہے! اور جہاں پر یہ صحرا ختم ہوتا ہے وہاں سے جادوگروں کا دیس شروع ہوتا ہے۔"

" اس صحرا کو پار کرنے میں کتنے دن لگیں گے۔"

سات راتوں کے سفر کے بعد جادوگروں کا دیس آئے گا لیکن جادوگروں کے دیس میں ہم لوگ نہیں جاسکتے۔ اور نہ وہ لوگ ہماری وادی میں آسکتے ہیں۔ البتہ ان دونوں ملکوں کے بیچ میں یہ جو صحرا ہے اسے خاص خاص موقعوں پر دونوں قوموں کے لوگ استعمال کر سکتے ہیں۔ مگر اس کے آگے ہم لوگوں کو اپنے بڑے رتھ کے آگے چاند کا جھنڈا لہرانا ہوگا۔ اور صرف رات میں سفر کرنا ہوگا۔"

"صرف رات میں کیوں؟" موہنی نے پوچھا۔

"کیوں کہ رات میں جادوگروں کا جادو نہیں چلتا۔ صرف دن میں چلتا ہے"

سات راتوں کے سفر کے بعد بچے جادوگروں کے دیس کی سرحد پر پہنچ گئے۔ ابھی کچھ رات باقی تھی۔ صبح ہوئی نہ تھی۔ سامنے جہاں صحرا ختم ہوتا تھا وہاں پر ایک بہت بڑا دروازہ تھا۔ جس میں جلی حروف میں لکھا تھا

جادوگروں کا دیس

ہمارے دیس میں داخل ہونے کے لئے نیچے لکھی ہوئی شرطیں غور سے پڑھیے:۔

۱۔ بغیر اجازت اندر آنا منع ہے۔
۲۔ بغیر اجازت اندر آنے والوں کو مکھی بنا دیا جائے گا۔
۳۔ ماچس کی ڈبیا یا سگریٹ لائیٹر یا ایسی کوئی چیز جس سے آگ لگتی ہو وہیں کسٹمز پر ضبط کر لی جائے گی۔
۴۔ دن میں آپ ہر جگہ گھوم سکتے ہیں۔ لیکن رات کو پولیس کی حوالات میں سونا ہوگا۔
۵۔ جتنے دن رہنا ہو اتنے دن کا کھانا ساتھ لائیے۔
۶۔ داخل ہونے کے لئے کسی ایک نہ ایک جادو کا جاننا ضروری ہے۔ جادو نہ جاننے والوں کو کان گھما کر خرگوش بنا دیا جائے گا۔
۷۔ عورتوں کو جادو جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ ہر عورت جادوگر ہوتی ہے اس لئے ان کا داخلہ فری ہے۔

بحکم

سردار اعلیٰ مملکت جادوگراں

ارضِ ماہتاب

"آہاہاہا۔ مزا آگیا۔" موہنی حکم نامہ پڑھ کر بولی۔ "ہم عورتوں کے لئے کسی جادو جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن تم مردوں نے اگر کوئی جادو نہ بتایا تو جادوگروں کے دیس میں داخل تک نہ ہو سکو گے۔"

"دیکھا جائے گا۔" عرفی غصے سے بولا۔ "چلو آگے بڑھو!" عرفی نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھہرو!"

بچوں نے حیران ہو کر دیکھا۔ سامنے ایک فقیر نیک صورت، ایک ہاتھ میں کشکول گدائی دوسرے ہاتھ میں موتیوں کی مالا لئے کھڑا تھا۔ اس کی سفید داڑھی گھٹنوں تک آتی تھی۔ اور اس نے چاندی کے کپڑے کی قبا پہن رکھی تھی۔ اور اس کے پاؤں ننگے تھے۔ لیکن اس کے پاؤں دیکھ کر ناز کے منہ سے حیرت کی ایک چیخ نکل گئی۔ کیوں کہ اس فقیر کے پاؤں گو ننگے تھے لیکن پتھر کے بنے ہوئے تھے۔

"یہ کیا ماجرا ہے؟" عرفی حیرت سے فقیر کی طرف دیکھ کر بولا۔ "بیٹا!" فقیر نے اسے اپنی رام کہانی سناتے ہوئے کہا۔ "سو سال کا عرصہ ہوا جس صحرا سے تم گزر کر آئے ہو یہ ایک سرسبز اور شاداب علاقہ تھا۔ یہاں دن کو سورج نکلتا تھا اور رات کو زمین! میں اس علاقے کا شہزادہ تھا۔ میرا نام ماہِ تمام ہے۔ ایک شب کو جب

میں اپنی بائیسویں سال گرہ کے جشن میں شریک تھا۔ جب چاروں طرف زمین کی دھیمی دھیمی روشنی پھیلی ہوئی تھی، میں نے ایک رقّاصہ کو دیکھا۔ اس کا ناچ بہت خوب صورت تھا اور وہ خود بھی بیحد حسین تھی۔ وہ چاند کی رہنے والی معلوم ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ زمین کی پری ہو۔" فقیر نے ناز اور موہنی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔" وہ عورت تم لوگوں کی طرح بدصورت نہ تھی۔"

"اجی جناب۔" موہنی نے غصّے میں آ کے کہا۔" آپ کیا کہتے ہیں۔ ہم لوگ زمین ہی سے آئے ہیں۔"

"بالکل جھوٹ۔" فقیر نے اور بھی غصّے میں آ کے کہا۔" زمین پر تو پریاں رہتی ہیں۔ ہماری دادی اماں بتایا کرتی تھیں۔"

"اور ہماری دادی اماں!" ناز نے کڑک کر کہا۔" ہمیں بتایا کرتی تھیں کہ چاند پر پریاں رہتی ہیں۔ بس دُور کے ڈھول سہانے معلوم ہوتے ہیں۔ چاند میں آ کے پتا چل گیا یہاں کیسے کیسے پری زاد رہتے ہیں، جن کے پاؤں پتھر کے ہیں اور داڑھی گھٹنوں تک لمبی ہے۔"

فقیر اداس ہو کے بولا۔" میری یہ حالت تو ان کم بخت جادوگروں نے کر دی ہے۔"

جمی نے پوچھا۔" یہ کیسے ہوا؟"

فقیر نے آہ بھر کے کہا۔" میں اس کم بخت رقّاصہ کو شادی کا پیغام دے بیٹھا۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔ جب میں بہت گڑگڑایا تو اس نے کہا۔ میں تم سے شادی تو کر لوں گی مگر ایک شرط پر!" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔" وہ

شرط کیا ہے ؟"

وہ بولی: "اگر تو اپنا ملک جادوگروں کے نام لکھ دے تو میں تجھ سے شادی کر لوں گی"

میں نے کہا: "یہ ملک تو میرا نہیں ہے۔ میری رعایا کا ہے۔ میں اسے کسی کے نام کیسے لکھ سکتا ہوں ؟"

پھر وہ بولی: "اچھا تو مجھے اجازت دے کہ میں تیری رعایا کو جادو کے زور سے ہوشیار کر دوں"

میں نے کہا: "اس کی بھی اجازت نہیں دے سکتا۔ وہ لوگ اگر ہوشیار ہو گئے تو میرا راج چلا جائے گا"

وہ بولی: "اچھا تو مجھے ایک لاکھ ڈالر سونے کے لاکے جہیز میں دے۔

میں نے کہا: "میرے ملک میں صرف چاندی ہوتی ہے۔ سونا کہاں سے لاؤں"

وہ بولی: "اچھا تو جو کہتا ہے میں تجھ سے سچی محبت کرتا ہوں تو تو میرے لئے کیا کر سکتا ہے۔"

میں نے کہا: "میں تیرے لئے رو سکتا ہوں"

"اور کیا کر سکتا ہے ؟" وہ جل کر بولی۔

"اور تجھ سے محبت کر سکتا ہوں" میں نے پھر اس سے کہا۔ میری بات سن کر وہ کچھ سوچنے لگی آخر کہنے لگی: "کیا تو یہی الفاظ میرے ملک میں چل کے سب کے سامنے کہہ سکتا ہے ؟"

میں نے کہا "ضرور کہہ سکتا ہوں"

یہ سن کر وہ مسکرائی اور اس نے ناچنا شروع کیا۔ اور ناچتے ناچتے پیچھے ہٹتی گئی۔ اور میں اس کے خوب صورت چہرے اور اس کے ناچ میں مدہوش ہو کر اس کے ساتھ ساتھ جادوگروں کے دیس میں چلا آیا اور مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ میں کہاں ہوں مگر جب وہ مجھے اپنے دیس میں لے آئی تو اپنے شہر کے سب سے بڑے چوک میں لے جا کے کہنے لگی۔ —— "اب یہاں سب کے سامنے کہہ دے۔ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں!!"

میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اور یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ جادوگروں کے دیس میں ایک خوب صورت لڑکی موجود تھی۔ ہر لڑکی شہزادی بلکہ پری معلوم ہوتی تھی۔ کیوں کہ جادو کے زور سے بنائی جاتی ہے۔ اس لئے بے حد حسین ہوتی ہے بلکہ ان کے سامنے تو وہ لڑکی معمولی شکل وصورت کی معلوم ہوتی تھی۔ یہاں آکر وہ عورت بالکل میری نظروں سے اتر گئی۔ اب میرا جی نہ چاہتا تھا کہ میں اس عورت سے کہوں کہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ اور اور وہ برابر اصرار کرتی جا رہی تھی کہ کہہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ چناں چہ شرما شرمی میں میں نے کہہ دیا۔ "میں تجھ سے محبت کرتا ہوں!" میرا یہ کہنا تھا کہ فلک سے آواز آئی۔

"جھوٹے مکار۔ فریب کرتا ہے۔ ہمارے دیس کی معصوم عورت کو دھوکا دیتا ہے۔ چل تجھے سیل پتھر کر دیا۔ اور جتنی تیری محبت ہے اتنا ہی تجھے پتھر کیا۔

اسی وقت سے میرے پاؤں پتھر کے ہو چکے ہیں۔ اس رقاصہ نے جب میرا یہ حال دیکھا تو رونے لگی۔ بولی:" افسوس تمھاری محبت سچی نہ تھی۔ ورنہ

میں تمھیں اپنے گھر لے جاتی۔"

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی "اگر تمھاری محبت سچی ہوتی تو تم محبت کا لفظ ادا کرتے ہی سر سے پاؤں تک پتھر کے ہو جاتے اور پھر میں تمھیں اٹھا کر اپنے گھر لے جاتی اور تمھیں اپنا شوہر مان کر دن رات تمھاری پوجا کرتی۔ لیکن تم بڑے جھوٹے نکلے۔ تمھارے تو صرف پاؤں پتھر کے ہوئے ہیں۔"

"تو کیا تم لوگوں کے خاوند بالکل پتھر کے ہوتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی "یہ ان لوگوں کی محبت اور وفا پر منحصر ہے۔ کچھ خاوند صرف گھٹنوں تک پتھر کے ہوتے ہیں، کچھ کمر تک، کچھ سینے تک، جو بالکل سچے اور باوفا ہوتے ہیں وہ سر سے پاؤں تک پتھر کے بن جاتے ہیں۔ پھر ہم انھیں طاق میں رکھ کر ان کی پوجا کرتے ہیں۔"

"اب تم مجھے کیا سزا دو گی؟" میں نے پوچھا۔

رقاصہ نے تالی بجا کے دو جادوگروں کو بلایا اور ان سے کہا کہ مجھے دروازے کے باہر چھوڑ آئیں۔ میں نے اُسے سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ سمجھایا بجھایا کہ خاوند پتھر کا نہیں گوشت پوست کا اچھا ہوتا ہے۔ مگر وہ بولی "نہیں مجھے تو پتھر کا خاوند چاہیے۔ جو بالکل ہیرا ہو جسے میں طاق میں بٹھا سکوں۔ جسے میں چوبیس گھنٹے اپنے سامنے رکھ سکوں! تمھارے تو صرف پاؤں پتھر کے ہوئے ہیں۔ تمھیں اپنے گھر لے جاؤں گی تو محلے ٹولے کی عورتیں مجھے کیا کہیں گی؟"

"چناں چہ اس دن سے میں اس دروازے کے باہر پڑا ہوں۔ اور اپنی سزا بھگت رہا ہوں۔ جادوگروں نے جادو کے زور سے میرے علاقے کو صحرا میں تبدیل کر دیا ہے۔ اور مجھ سے چوں کہ چلا نہیں جاتا۔ اس لئے اس دروازے کے باہر کھڑا بھیک مانگتا ہوں۔ اور جو لوگ جادوگروں کے دیس میں جانا چاہتے ہیں۔ انھیں اندر جانے سے منع کرتا ہوں۔ سو سال سے میرا یہی کام ہے۔"

"تمھیں اس سزا سے رہائی کیسے مل سکتی ہے؟" جمّی نے اس سے ہمدردی کرتے ہوئے پوچھا۔

"اگر کوئی عورت، دنیا کی کوئی عورت، کائنات کی کوئی عورت میرے لئے رو دے اور اس کے دو آنسو میرے پاؤں پر پڑیں تو میرے پتھر کے پاؤں پھر سے ٹھیک ہو جائیں گے۔ اور میں چل پھر سکوں گا۔" یہ کہہ کر فقیر بڑی عاجزی سے ناز اور موہنی کی طرف دیکھنے لگا۔

"نوج!" ناز غصّے میں بولی "کس عورت کو پڑی ہے جو تمھارے ایسے جھوٹے مکّار کے لئے دو آنسو بہائے، چلو جی اندر چلیں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" موہنی نے ناز کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا، "اور میں بے چاری تو تتلی بننے کی ہوں۔" تتلی بولی "رو ہی نہیں سکتی! اس لئے مجھے تو معاف کیجیے۔"

عرفی نے کہا "کیوں ایک بڈھے فقیر کی جان کو آ رہی ہو؟ چلو اندر چلو!" یہ کہہ کر عرفی نے اپنے حصّے کے کھانے میں سے تھوڑا سا فقیر کے کشکول میں ڈالا اور آگے بڑھ گیا۔

فقیر اُسے دعائیں دے کر بولا: "بچہ تو مجھے دل کا بہت نیک معلوم ہوتا ہے۔ میری ایک صلاح مان لے۔ جادوگروں کے دیس میں نہ جانا۔ وہاں کی عورتیں بلائیں ہوتی ہیں تو ضرور پتھر بن جائے گا۔"

عرفی نے کہا: "آپ فکر نہ کریں، فقیر نیک صورت، آپ کی کہانی سننے کے بعد میں ہرگز کسی کے دھوکے میں نہ آؤں گا۔"

فقیر اپنی جیب ٹٹولتے ہوئے بولا: "جاتا ہے تو جا مگر میرا ایک تعویذ لیتا جا۔"

فقیر نے ایک چھوٹا سا کاغذ کا تعویذ عرفی کو دیا۔ عرفی نے تعویذ کو اپنی جیب میں رکھ کر پوچھا بابا اس کے استعمال کرنے کا طریقہ کیا ہے۔

فقیر بولا: "بیٹا جب تو کسی مصیبت میں پھنس جائے تو لازم ہے کہ تو اس تعویذ کو جیب سے نکال کر تین بار چومے۔ تین بار چوم کر تین بار اسے اپنے ماتھے سے لگالے۔ پھر اپنے سر پر سات جوتے مارے اور بولے۔

گرڑام برڑم با
گرڑام برڑم با
میری مدد کو آ
میری مدد کو آ

پھر دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ مگر اپنے سر پر سات جوتے مارنا نہ بھولنا۔"

"بہت اچھا!" عرفی نے تعویذ لے کر احتیاط سے اپنی جیب میں رکھ لیا اور سب بچوں کو لے کر جادوگروں کے دیس میں داخل ہوا۔

جادوگروں کے دیس میں داخل ہوتے ہی بچوں کو کسٹم چوکی پر روک لیا گیا اور ان کے سامان کی تلاشی لی گئی۔ اور ماچس کی ڈبیا ضبط کر لی گئی۔

پوچھنے پر کسٹم آفیسر نے کچھ نہ بتایا۔ مسکرا کر کہنے لگا: "اب آپ لوگ ہمارے دیس کے اندر جا سکتے ہیں۔ مگر اس سے پہلے آپ کو جادو کا تماشا دکھانا ہوگا۔"

"کس قسم کا تماشا؟" جمی نے پوچھا

"کوئی بھی جادو کا کھیل!"

"پہلے تم کر کے دکھاؤ!" جمی بولا۔

"کسٹم آفیسر نے جمی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اب اس کے ہاتھ میں مرغی کے تین انڈے تھے۔

جمی نے کسٹم آفیسر کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اب جمی کے ہاتھ میں ریڈیو کے والو تھے۔

"یہ کیا ہے؟" کسٹم آفیسر نے پوچھا

جمی بولا: "یہ کانچ کے انڈے ہیں۔"

کسٹم آفیسر ریڈیو والوں کو حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے جمی سے کہا: "تم اندر جا سکتے ہو۔"

اب عرفی کی باری تھی۔ کسٹم آفیسر نے پھر پوچھا: "جادو کا تماشا دکھاؤ۔

"پہلے تم دکھاؤ!" عرفی نے جواب دیا۔

کسٹم آفیسر نے میز پر سے ایک کاغذ اٹھایا: "دیکھو یہ سفید کاغذ ہے نا؟"

"ہاں۔"

کسٹم آفیسر نے کاغذ کو دوہرا تہرا کیا۔ اسے منہ میں ڈال کر نگل گیا۔

پھر عرفی سے بولا:" کہو ایک دو تین چار!"

عرفی نے کہا:" ایک دو تین چار!"

چار سنتے ہی کسٹم آفیسر نے منہ سے کاغذ کی ایک لمبی سی نلکی نکالی جس کا رنگ بالکل سُرخ تھا۔

کسٹم آفیسر نے کہا،" دیکھا میرا جادو۔ منہ میں ڈالا تھا سفید کاغذ نکالا سُرخ کاغذ!"

" یہ کون سی بڑی بات ہے؟ عرفی نے کہا،" اب میرا جادو دیکھیے!"

اس نے اپنے پاندان سے ایک پان کا پتا نکال کر کہا:" یہ پتا دیکھیے۔ اس کا رنگ کون سا ہے؟"

" سبز ہے"

عرفی نے پان منہ میں ڈالا اور کہا:" اب آپ کہیے، ایک دو تین چار!"

کسٹم آفیسر دھیرے سے کہنے لگا۔ ایک دو تین چار!"

" ایک بار پھر کہو"

" ایک دو تین چار!"

" وہ رہی پان کی دھار!" عرفی نے پان کی سُرخ پیک زور زور سے ایک طرف تھوکتے ہوئے کہا:" دیکھا میرا جادو۔ منہ میں ڈالا تھا سبز پتا، نکلا سُرخ پانی! کسٹم آفیسر نے حیرت سے پوچھا:" آپ لوگ کہاں سے آتے ہیں؟"

ناز بولی:" ہم لوگ زمین سے آئے ہیں"

کسٹم آفیسر بولا "زمین سے ؟ سُنا ہے وہاں کا جادو بڑا زبردست ہوتا ہے۔ وہ لوگ سنا ہے ہوا میں اڑ سکتے ہیں۔ پانی پر چل سکتے ہیں ؟"

"ٹھیک ہے !" موہنی نے غرور سے ذرا تن کر کہا،

"اور سُنا ہے وہاں کے جادوگر ایسے مکان بناتے ہیں جن میں آگ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔"

"ہاں اینٹوں کے مکان ہوتے ہیں۔ تو کیا؟" ناز پوچھنے لگی۔

"تمہارے ہاں مکان اینٹوں کے نہیں ہوتے ؟"

"اینٹ کیا ہوتی ہے ؟" کسٹم آفیسر بولا "ہم تو نہیں جانتے۔ یہ جادو ہمارے ہاں تو مکان کاغذ کے ہوتے ہیں !"

واقعی اب جو بچوں نے غور سے دیکھا تو کسٹم چوکی کی عمارت ساری کی ساری کاغذوں کی بنی ہوئی تھی۔ نہ صرف کسٹم چوکی بلکہ جب جمی نے کسٹم آفیسر کو ہاتھ لگایا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی کاغذ کا بنا ہوا ہے۔ پرانے اخباروں کو جوڑ جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ اور جادو کے زور پر بولتا تھا اور چلتا تھا۔ کسٹم چوکی سے باہر نکل کر جب انھوں نے شہر میں قدم رکھا تو وہ حیرت میں رہ گئے۔ سڑک کاغذ کی تھی، فٹ پاتھ کاغذ کا تھا۔ پہرہ دینے والا سنتری کاغذ کا تھا۔ اور سڑک کے دونوں طرف جو بڑی بڑی عمارتیں کھڑی تھیں۔ وہ بھی کاغذ کی، دوکانوں میں جتنا سامان رکھا تھا وہ سب کاغذ کا۔ بچوں کے لئے کھلونے کاغذ کے، سپاہیوں کی بندوقیں کاغذ کی، پھل کاغذ کے، مٹھائیاں کاغذ کی، بڑی خوب صورت اور رنگین مٹھائیاں تھیں، سب کاغذ کی تھیں۔

کسٹم چوکی ہی سے بچوں نے جادوگروں کا دیس دیکھنے کے لئے ایک گائیڈ کرائے پر لے لیا تھا۔ یہ گائیڈ بے چارہ بہت غریب تھا اور نہایت ہی پھٹے پرانے اخبار کے ٹکڑوں کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کا رنگ کہیں سے پیلا، کہیں سے بھورا کہیں سے سیاہ تھا اور جگہ جگہ اس کے جسم کے اوپر کی وارنش اتر چکی تھی۔ اور اخباری سرخیوں کے نشان جگہ جگہ واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔

موہنی نے گائیڈ کی انگلی پکڑ کر کہا: "اچھے گائیڈ جی ہمیں شہر دکھا دیجئے" گائیڈ ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ چونک کر موہنی نے بھی اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ گائیڈ کی انگلی فٹ پاتھ پر گر گئی۔ گائیڈ نے جلدی سے انگلی فٹ پاتھ سے اٹھالی اور کوٹ کی جیب میں سے گوند دانی نکال کر گوند سے پھر اپنی انگلی کو ہاتھ میں چپکا دیا اور معذرت کرتے ہوئے بولا "معاف کرنا۔ میں بہت پرانے اخبار کا بنا ہوا ہوں "صادق الاخبار" جو آج سے اسّی سال پہلے موچی گیٹ لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ اس لئے ہاتھ لگاتے ہی جھڑ جھڑ کر شکستہ ہونے لگتا ہوں مجھے ہاتھ مت لگایئے۔"

جمی نے کہا "یہ کیا ماجرا ہے؟ یہاں ہر چیز کاغذ کی بنی ہوتی ہے اور کاغذ بھی اخباری معلوم ہوتا ہے۔"

گائیڈ نے اک آہ بھر کے کہا: "خواتین وحضرات۔ ناظرین باتمکین۔ قارئین خوش خصال یہ قصّہ بہت پرانے زمانے کا ہے۔ آج سے کئی سو سال پہلے جب چینی جادوگروں نے کاغذ ایجاد کیا۔ اس زمانے کا ذکر ہے کہ اس دنیا کو چینی جادوگروں نے آکر پہلے پہل آباد کیا۔ ان لوگوں کو چوں کہ کاغذ سے عشق

تھا اس لئے انھوں نے یہاں آکر ہر چیز کاغذ کی بنا ڈالی۔ ہوتے ہوتے یہاں دنیا بھر کے اخباری جادوگر آنے لگے اور آباد ہونے لگے۔ اب تو یہ حال ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی اخباروں میں جتنی جھوٹی خبریں پہنچتی ہیں جتنی لڑائیاں ہوتی ہیں جتنے فساد ہوتے ہیں، ملکوں اور قوموں کے درمیان جتنے جھگڑے ہوتے ہیں یہیں کے جادوگروں کی معرفت دنیا کے اخباروں میں چھپتے ہیں یہاں کے جادوگروں کا کوئی اور کام نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ لوگوں میں ملکوں میں قوموں میں جنگیں کراتے رہیں۔ اخبار یہاں کے لوگوں کا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ یہ لوگ اخبار کھاتے ہیں۔ اخبار پر سوتے ہیں۔ اخبار لکھتے ہیں۔ اخبار پڑھتے ہیں۔ اخبار پیتے ہیں اور جس دن دنیا میں کوئی اخبار بند ہوتا ہے، یہاں پر کسی نہ کسی جادوگر کی موت ہوتی ہے۔ پھر ہم لوگ ان اخباروں سے یا کتاب کی تمام جلدیں اور فائلیں یہاں منگا لیتے ہیں اور جادو کے زور سے اس پر دم کر کے ان کے آدمی بنا ڈالتے ہیں یا ان سے دوسری چیزیں بنا ڈالتے ہیں آپ اکثر تعجب کرتے ہوں گے کہ ابھی ابھی میز پر یہاں اخبار رکھا تھا وہ کدھر گیا۔ یہاں شیلف پر کتاب رکھی تھی، کہاں غائب ہو گئی۔ رسالے کی فائل بھی کدھر گم ہو گئی۔ آپ کو معلوم بھی نہیں ہوتا اور چند منٹ میں جادو کے زور سے وہ تمام کتابیں کاپیاں اور رسالے اخبار ہماری دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔"

ناز نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ "تو کیا مکتبہ جامعہ کی کتابوں سے بنائے گئے آدمی بھی یہاں موجود ہیں؟"

"کیوں نہیں؟"

"زرا ہمیں وہاں لے چلیے۔"

گائیڈ نے اسی وقت ہاتھ کے اشارے سے بازار سے گزرنے والے تین چار خالی رکشا روک لیے۔ یہ رکشا بھی کاغذ کے بنے ہوئے تھے اور ان کے چلانے والے بھی کاغذ کے تھے۔ سب سے پہلے کے رکشا میں جمی لپک کر سوار ہوا۔ لیکن سوار ہوتے ہی رکشا دھڑسے زمین پر بیٹھ گیا اور رکشا چلانے والے کے منہ سے چیخ نکلی اور اس کے دو ٹکڑے بھی ہو گئے۔ اتنے میں بہت سی کاغذی لوگوں کا وہاں مجمع ہو گیا۔ اور لوگ چیخنے چلانے لگے اور بچوں کو گھونسے دکھانے لگے۔

جمی نے مکا تان کے کہا: "میں لوہے کا بنا ہوا ہوں مجھے گھونسا مت دکھاؤ ساری جادوگری نکال کے پھینک دوں گا۔ کاغذی پہلوان!"

مگر لوگ اور بھی شور مچانے لگے۔ بچے چاروں طرف سے گھر گئے۔ اتنے میں پولیس کا سپاہی بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے پوچھا "کیا ہوا؟"

"ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ یہ رکشے والا مر گیا۔ اور اس کا رکشا بھی ٹوٹ گیا۔ زمین سے یہ چند سیاح آئے ہیں۔ یہ سب ان کی بدمعاشی ہے۔"

"باہر سے سیر کرنے کے لیے آتے ہیں۔ یہاں آکے ہیکڑی جتاتے ہیں" مجمع میں کچھ لوگ زور زور سے چلانے لگے۔

"زمین مُردہ باد۔"

"جادوستان زندہ باد۔"

"زمین مردہ باد۔"

سنتری نے لوگوں کو ہٹایا۔ رکشے کا اور گائیڈ کا نمبر نوٹ گیا۔ اور ایک پرچہ چاک کر کے گائیڈ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اور کہا "آج رات کے دس بجے ان لوگوں کو شہزادی کے حضور میں پیش کرو!"

گائیڈ نے کہا۔ بہت اچھا!" اور پھر بچوں کو لے کر پیدل ہی روانہ ہو گیا۔

یہ بلڈنگ بہت بڑی تھی۔ نیچے اوپر سات تو اس کی منزلیں تھیں اور کئی سو کمرے تھے اس کے اور دنیا میں جتنے اخبار اور رسالے بچوں کے لئے چھپتے ہیں ان سب کے بنے ہوئے کاغذی بچے یہاں پر موجود تھے۔ موہنی اور ناز کے اصرار پر گائیڈ انھیں سب سے پہلے مشرق کی منزل میں تیسرے کمرے میں لے گیا۔ یہ ایک بہت بڑا کمرہ تھا اور چوں کہ جادو کا کمرہ تھا اس لئے جتنا چھوٹا سمجھو اتنا چھوٹا ہو جاتا تھا اور جتنا بڑا سمجھو اتنا بڑا ہو جاتا تھا۔ یہاں ہزاروں کاغذی بچے کھیل رہے تھے۔ اور شور مچا رہے تھے۔ ایک کونے میں ایک خوب صورت میز کے سامنے دس بارہ برس کا ایک لڑکا اچکن پہنے بڑے ہی سنجیدہ انداز میں بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ موہنی نے جھک کے دیکھا۔ رسالے کا نام تھا بچوں کی دنیا!

گائیڈ نے بچوں کا تعارف کرایا۔ وہ لڑکا زمین کے بچوں سے مل کر بہت خوش ہوا۔ اور جب اُسے معلوم ہوا کہ یہ لوگ اس ملک سے آئے ہیں جہاں رسالہ بچوں کی دُنیا چھپتا ہے تو اس کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

کہنے لگا: ایڈیٹر صاحب کہاں گئے ہوتے۔ ان سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔

"وہ آج کل سوئیزر لینڈ گئے ہوئے ہیں" عزی نے بتایا تو اسسٹنٹ اڈیٹر کیا کر رہے ہیں وہ تین مہینے تک امریکہ انگلینڈ وغیرہ گھوم کر وہاں کے بچوں سے مل کر آئے ہیں اور آج کل بے حد مصروف ہیں تو سب اسسٹنٹ اڈیٹر کو لائے ہوتے ہم انہیں دکھاتے کہ یہاں بچوں کے پرچوں کو ہم نے کیسی کیسی جادوگری کی ہے۔ کاغذی لڑکے نے ہاتھ کے اشارے سے بتلاتے ہوئے کہا "اس ہال میں جتنے بچے جمع ہیں وہ سب کے سب ہندوستان اور پاکستان کے بچوں کے پرچوں سے بنائے گئے ہیں نہ صرف بچے بلکہ ان رسالوں کے کردار بھی یہاں موجود ہیں وہ دیکھئے میاں فولادی"

جمی نے ایک کونے میں دیکھا واقعی میاں فولادی ہی تھے۔ اور کھلونا کے مطالعہ میں گم تھے۔

"وہ دیکھئے ٹلو میاں اور ببلی صاحب"

"ارے واقعی یہ تو بالکل وہی ہیں" موہنی خوشی سے چلاّ کے بولی۔ "اور بھائی جان پڑھ رہے ہیں"

"وہ دیکھئے گوڈ پاپا" کاغذی لڑکے نے دکھایا۔ وہ رہا الّو جو چڑیوں کی الف لیلہ پڑھ رہا ہے۔ وہ ہمدرد نونہال بچہ چالاک خرگوش کاغذ سے بنا رہا ہے۔ وہ بچہ پیام تعلیم سے شائد کوئی لطیفہ نقل کر رہا ہے۔ وہ بچہ چندا ماما کی جادوگری کی داستان پڑھ رہا ہے۔ اور خود بھی چندا ماما کے کاغذوں سے بنا ہے۔"

واقعی یہ عجیب دنیا تھی۔ یہاں ہر زبان ہر ملک اور ہر قوم کے بچے اور ان کے رسالے موجود تھے۔ اور ان رسالوں کی کہانیوں کے جتنے مشہور کردار بچوں کو پسند تھے وہ سب کے سب یہاں مختلف کمروں میں جمع تھے۔ یہاں بچوں نے کاغذی ٹارزن کو دیکھا جو ہو بہو زمین کے ٹارزن کی نقل تھا۔ اور بالکل اسی کی طرح چلاّتا تھا۔ جادوگردں کے بچے اس ٹارزن سے بہت خوف کھاتے تھے۔

اور وہ بھی ان پر بے جا دھونس جماتا تھا۔ جب زمین کے بچے اُسے دیکھنے کے لئے آئے تو اس نے ان کی پرواہ نہ کی اور اٹھ کر سلام تک نہ کیا۔ وہ اس وقت کاغذ کے ایک پیڑ پر بیٹھا ہوا "کامک" پڑھ رہا تھا۔

ناز بولی: "ٹارزن صاحب ذرا نیچے اتر آیئے۔ ہم آپ کی صورت تو دیکھیں"!

"ہو ہو!" ٹارزن زور سے چلّایا۔ مجھ کو فرصت ناہیں!" اور پھر کامک پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

"دیکھیے!" عرفی ہنس پڑی اور جمّی کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"لنگوروں کا بادشاہ آپ سے لڑائی کرنے کے لئے آیا ہے"۔

"ہو ہو!" ٹارزن نے کامک کی کتاب زور سے نیچے جمّی پر پھینک دی۔ پھر وہ کاغذ کے رسّے پر جھولتا اور چھلانگ لگاتا ہوا نیچے اترا اور آتے ہی اس نے جمّی کے ایک گھونسا رسید کیا۔

جمّی وہیں کھڑا کھڑا ہنستا رہا۔

"ٹارزن نے غور سے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ اس کا دایاں ہاتھ ٹوٹ گیا تھا۔ ٹارزن نے اب کے بائیں ہاتھ سے دوسرا گھونسہ جمّی کے منہ پر دیا۔ جمّی نے منہ کھول دیا۔ اب کے ٹارزن کا اخباری ہاتھ جمّی کے منہ میں پھنس کے رہ گیا۔ جب ٹارزن الگ ہوا تو جمّی بڑے مزے سے ٹارزن کا ہاتھ اپنے منہ میں چبا رہا تھا۔

ٹارزن نے حیرت سے کہا: "یہ کیا جادو ہے! اس چھوٹے سے لڑکے نے مجھے یعنی ٹارزن کو بھی ہرا دیا ہے۔ جسے اس دنیا میں کوئی ہرا نہیں سکا۔

گائیڈ بولا" میاں ٹارزن ہوش میں رہو۔ یہ ان بچوں کے دل کی بہادری ہے جو تمھیں اتنا دلیر بناتی ہے۔ ورنہ تم ہو کیا؟ اب آرام سے بیٹھو۔ جب اگلے مہینے کا پرچہ آئے گا تو تمھیں نئے بازو ملیں گے۔"

اتنا کہہ کر گائیڈ بچوں کو اس بلڈنگ سے باہر لے گیا۔ اور بولا "آیئے اب آپ کو شہر کے دوسرے حصوں کی سیر کراؤں!"

جب گائیڈ بچوں کو لے کر باہر سڑک پر آیا تو دیکھا ایک فوجی ان کے انتظار میں کھڑا ہے۔

فوجی نے کہا: "شہزادی صاحبہ نے آپ لوگوں کو فوراً بلایا ہے چلیے!"

جمّی نے کہا۔ "اور ہم نہ چلیں تو!"

ناز بولی "چلو چلیں گے۔ کاغذی دیس کی شہزادی دیکھنے کو تو ملے گی۔"

کاغذ کا یہ محل جہاں شہزادی رہتی تھی بہت خوب صورت تھا۔ بس ایسا ہی تھا جیسے پریوں کی کہانیوں کی کتاب کی کسی تصویر میں دکھایا جاتا ہے۔ باغ میں کاغذ کے پھول تھے، کاغذ کے فوارے، محل کا سارا سامان کاغذ کا تھا۔ خود شہزادی اتنی حسین تھی کہ معلوم ہوتا تھا ابھی ابھی کسی تصویر والی کتاب سے نکال کر یہاں لائی گئی ہے۔

شہزادی نے پوچھا "تم لوگ یہاں کیوں آئے ہو؟"

شہزادی نے کہا: "کاغذ کے شہر میں زمین کے بچوں کا رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اس لئے ہمارا حکم ہے کہ تم لوگ فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔"

جمّی بولا "ہم تو اپنی چڑیا لے کے جائیں گے۔"

شہزادی بولی "چڑیا یہاں نہیں ہے وہ تو اُلٹا دیس گئی ہے تم لوگ وہیں جاؤ۔"

موہنی بولی "شہزادی صاحبہ! ہم لوگ اُلٹا دیس کیسے جائیں گے۔ اپنا راکٹ جہاز تو ہم بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔"

شہزادی نے کہا "تمھارے جانے کا بندوبست میں کئے دیتی ہوں۔"

شہزادی نے اتنا کہہ کے تالی بجائی۔ اسی وقت ایک کاغذی جادوگر ظاہر ہوا۔ شہزادی نے حکم دیا کہ ان لوگوں کو اسی وقت الٹا دیس پہنچا دیا جائے۔ جادوگر نے بچوں کو جادو کے ایک کاغذی غالیچے پر بٹھایا اور منتر پڑھ کر غالیچے کو ہوا میں اڑنے کے لئے کہا۔

غالیچہ اسی وقت ہوا میں اڑنے لگا اور ہوتے ہوتے بہت دور ہوا میں اڑنے لگا۔ اس کی رفتار بہت تیز تھی۔ پلک جھپکتے ہی وہ لوگ ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر گئے۔ پھر آہستہ آہستہ غالیچہ نیچے اترنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ لوگ الٹا دیس کے سب سے بڑے شہر کے چوک میں کھڑے تھے۔ جادوگر نے پھر منتر پڑھا اور بچوں سے رخصت ہو کر اسی غالیچے پر سوار ہو کر اپنے ملک واپس ہو گیا۔

الٹے دیس کی ہر بات الٹی تھی۔ بچوں نے دیکھا کہ یہاں پر جو لوگ پیدل چل رہے تھے، وہ سر کے بل چلتے تھے، موٹریں پیچھے سے آگے چلنے کے بجائے آگے سے پیچھے جا رہی تھیں۔ سکولوں میں نقشے الٹے لٹکے ہوئے تھے۔ اُستاد سر کے بل کھڑا ہو کر پڑھاتا تھا اور بچے کتاب کو الٹا رکھ کے پڑھتے تھے۔ موہنی نے ایک بچے سے پوچھا "ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

لڑکے نے جواب دیا "اس طرح سے سبق اچھی طرح سے یاد ہو جاتا ہے۔"
موہنی نے ناز سے کہا "جب ہی میں کہتی تھی کہ مجھے سبق یاد کیوں نہیں ہوتا ہے۔ آج معلوم ہوا کہ ہماری زمین پر پڑھنے پڑھانے کے انتظام میں ضرور کوئی نقص ہے۔"
بچے نے موہنی سے پوچھا "تم لوگ کیسے پڑھتے ہو۔"
موہنی نے کہا، ہم لوگ تو کتاب کو سیدھا رکھ کے پڑھتے ہیں۔"
"پھر کیا خاک سبق یاد ہوتا ہوگا۔" بچے نے انتہائی حقارت سے ہنس کر کہا اور اپنے کلاس روم میں چلا گیا۔
اسپتالوں میں بھی بچوں نے ایک اُلٹی بات دیکھی، یہاں مریضوں کو کونین کی بیماری ہوتی تھی اور انھیں ٹھیک کرنے کے لئے ملیریا کے مچھروں سے کٹوایا جاتا تھا۔ کچھ مریض پنسلین کی بیماری میں مبتلا تھے اور انھیں ٹھیک کرنے کے لئے دہی بڑے کی چاٹ کھلائی جاتی تھی تاکہ ان کا حلق خراب ہو۔ یہاں قبض دور کرنے کے لئے پیچش کے جراثیم کے ٹیکے لگتے تھے۔ ایک مریض ڈاکٹر کے پاس کھڑا شکایت کر رہا تھا۔ "صاحب مجھے سخت تکلیف ہے، بے حد بیمار ہوں۔"
"تمہیں کیا تکلیف ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا
"مجھے چھ سال سے بخار ہی نہیں ہوتا۔ اب میں کیا کروں۔ اس طرح تو میں ختم ہو جاؤں گا۔"
"مگر یہ تو بالکل صحت مند دکھائی دیتا ہے۔" ناز نے ڈاکٹر سے کہا،
ڈاکٹر نے کہا "یہی تو خطرناک بات ہے۔ اس آدمی کو چھ سال سے اچھی

صوت کی بیماری ہے۔"

ڈاکٹر نے اس مریض کی نبض دیکھ کر کمپونڈر سے کہا۔" اُسے بخار مکسچر دے دو۔ ایک سو چار ڈگری والا۔

"اس سے کیا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب؟" جمی نے پوچھا۔

ڈاکٹر بولا:" اس دوا سے اسے ایک سو چار ڈگری بخار ہوگا اور یہ مریض اچھا ہو جائے گا۔" پھر وہ ڈاکٹر زمین کے بچوں کو دیکھ کر بولا:" مگر آپ لوگ اُلٹے کیوں کھڑے ہیں، سیدھے کیوں نہیں کھڑے ہوتے شریف آدمیوں کی طرح؟"

ناز بولی:" ڈاکٹر صاحب، ہم لوگ اسی طرح اپنی زمین پر چلتے ہیں۔"

ڈاکٹر نے بے حد افسوس ظاہر کیا۔ اور کہا:" یہ بہت بڑی بیماری ہے۔ میرے خیال میں تو مجھے آپ کا آپریشن کرنا پڑے گا۔"

ڈاکٹر نے اسی وقت ہسپتال کے آٹھ دس اردلیوں کو بلا کے حکم دیا بچوں کو پکڑ کے آپریشن روم کی طرف لے جاؤ۔ اردلی ان بچوں کی طرف دوڑے ناز بہت چیخی چلائی۔ موہنی بھی ڈر گئی۔ اس موقع پر جمی اور عرفی نے اور تیلی نے بھی بڑی بہادری سے کام لیا اور چوں کہ سارے اردلی اُلٹے ہو کر بچوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس لئے بچوں نے بہت جلد میدان جیت لیا اور ہسپتال سے نکل بھاگے۔ ہسپتال سے نکل کر ان لوگوں نے ایک لمحے کے لئے اطمینان کا سانس لیا تھا کہ اتنے میں پولیس کی سیٹیاں بجنے لگیں اور موٹریں بچوں کو پکڑنے کے لئے بھاگنے لگیں۔ مگر چوں کہ موٹریں آگے سے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ اس لئے ان کے اور بھاگتے ہوئے بچوں کے درمیان فاصلہ کم ہونے

کے بجائے بڑھتا گیا۔ بھاگتے بھاگتے بچے شہر سے باہر نکل آئے اور ایک کھیت کے کنارے بیٹھ کر سستانے لگے۔

یہاں بچوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ جتنے کھیت تھے سب الٹے ہوئے تھے۔ پودوں کی جڑیں بھی اوپر ہوا میں معلق تھیں اور فصل کے خوشے زمین پر جھکے ہوئے تھے جو حال فصل کے پودوں کا تھا۔ وہی حال درختوں کا تھا۔ جڑیں اوپر ہوا میں تھیں اور پھل پھول زمین پر جھکے ہوئے تھے۔

بچے حیرت سے اس کا نظارہ کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک شیر دوڑتا ہوا آیا اور گھبرا کر ایک درخت کی جڑ پر چڑھ گیا۔ پہلے تو بچے شیر کو دیکھ کر بہت گھبرائے مگر جب انھوں نے خود شیر کو گھبراتے ہوئے دیکھا اور کانپتے ہوئے دیکھا تو اس سے پوچھنے لگے "شیر اس قدر پریشان کیوں ہو؟"

"تمہیں معلوم نہیں ہے؟ ایک بکری میرے پیچھے پیچھے آرہی ہے! وہ مجھے کھا جائے گی!"

"بکری شیر کو کھا جائے گی؟" ناز نے زور سے قہقہہ لگایا "ایسا بھلا کبھی ہو سکتا ہے!"

"ہمارے دیس میں یہی ہوتا ہے" شیر نے روتے ہوئے کہا "یہاں کی بکریاں بڑی ظالم ہوتی ہیں، شیروں کو کھا جاتی ہیں"

ابھی شیر ڈر کے مارے رو ہی رہا تھا کہ اتنے میں ایک بلی کہیں سے دوڑتی ہوئی آئی اور اسی درخت کی جڑ پر چڑھ گئی۔ وہ بھی بے حد گھبرائی ہوئی تھی اور خوف سے میاؤں میاؤں کر رہی تھی۔

"تمھیں کیا تکلیف ہے خالہ بلّی"

"چوہا!" بلّی نے ڈر کر کہا: "ایک بڑا موٹا سا چوہا مجھے کھا جانا چاہتا ہے۔ وہ دیکھو!"

بچوں نے پلٹ کر دیکھا تو زمین پر ایک چوہا اپنے سفید سفید دانت نکالے ہوئے للچائی ہوئی نگاہوں سے بلّی کو دیکھ رہا تھا۔ اور اس کے قریب ایک موٹی تازی بکری بار بار اپنے پاؤں زمین پر ٹیک کر گویا شیر سے کہہ رہی تھی "نیچے آؤ تو تمھیں کچا کھا جاؤں گی۔"

بچے اس عجیب و غریب باتوں کو حیرت سے کھڑے دیکھ رہے تھے اور ابھی وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ یہ کیسا الٹا دیس ہے جہاں کی ہر بات نرالی ہے کہ انھیں ایک بڈھا سڑک پر آتا ہوا ملا جو ایک ننھے لڑکے کی انگلی پکڑے چلا آ رہا تھا۔

عرفی نے ان دونوں کو غور سے دیکھ کر پوچھا: "بڑے میاں یہ تمھارا بیٹا ہے؟"

بڈھے نے کہا: "نہیں میں ان کا بیٹا ہوں۔"

تعجب کے مارے عرفی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ یہ بڈھا کیا بک رہا تھا۔ مگر بڈھے کے ساتھ جو ننھا لڑکا چلا آ رہا تھا اس نے بچوں کو سمجھایا: "ہمارے دیس میں سب بڈھے پیدا ہوتے ہیں۔" جب وہ پیدا ہوتے ہیں تو ان کے چہرے پر سفید داڑھی ہوتی ہے اور ان کے منہ میں دانت نہیں ہوتے، پھر آہستہ آہستہ عمر کے حساب سے بوڑھے ادھیڑ عمر کے ہو جاتے ہیں اور ادھیڑ عمر کے بعد وہ جوان ہوتے ہیں، جوانی سے گزر کر وہ لڑکے ہو جاتے ہیں۔ لڑکوں سے بچے بن جاتے ہیں، اور آہستہ آہستہ ان کی عمر گھٹتی جاتی ہے اور ان کا قد بھی گھٹتا جاتا ہے اور ایک دن وہ آتا

ہیں جب وہ صرف ایک دن کا بچّہ ہو کے رہ جاتے ہیں اور اس کے بعد مرجاتے ہیں، ہمارے ہاں سب لوگ ایک سو برس کے پیدا ہوتے ہیں اور ایک دن کے ہو کے مرجاتے ہیں!"

نانو نے بڑی حیرت سے اُلٹا دیس کے بچّے کو دیکھ کر پوچھا: "اور تمھاری عمر اب کیا ہے!" چھوٹے بچّے نے جواب دیا: "اب میں پچانوے سال کا ہوں۔"

"اور یہ تمھارا باپ؟" "افوہ میرا مطلب ہے تمھارا بیٹا!" لڑکے نے بڈھے کی طرف اشارہ کرکے کہا: "یہ میرا بچّہ ابھی بہت چھوٹا ہے۔ اس کی عمر ابھی صرف سات سال کی ہے!"

"بھاگو۔ بھاگو!" جمی اور عرفی نے لڑکیوں سے کہا۔

"بھاگو اس الٹا دیس سے۔ وہ ہماری چڑیا تو یہاں ایک دن نہیں رہ سکتی، کہیں اور چل کے اسے ڈھونڈیں گے۔"

"ٹھیرو۔" بچّے نے کہا: "تم لوگ ہمارے مہمان ہو۔ کھانا تو کھاتے جاؤ۔"

"تم لوگ کھانا کیسے کھاتے ہو بھلا؟" عرفی نے پوچھا۔

بچّے نے کھیتوں کی طرف رُخ کرکے کہا: "ادھر دیکھو کھیتوں میں کیا اُگا ہے۔"

یہ گیہوں کا ایک الٹا کھیت تھا۔ جڑیں ہوا میں تھیں اور خوشوں پر گیہوں کی سنہری روٹیاں لگی تھیں۔ الٹا دیس کا بچّہ بولا۔

"ہمارے کھیتوں میں روٹیاں اُگتی ہیں۔ ہم انھیں پودوں سے توڑ کر چکی میں پیس دیتے ہیں۔ اس سے جو آٹا ہوتا ہے اُسے کارخانے میں بھیج دیتے ہیں۔"

"کارخانے میں کیوں بھیج دیتے ہیں۔ روٹیاں توڑ کر کیوں نہیں کھا لیتے!"

"معلوم ہوتا ہے تم زمین کے لوگ بہت جاہل ہو۔ آج سے دو سو سال پہلے ہمارے دیس کے لوگ بھی تمہاری طرح وحشی اور غیر مہذب تھے۔ وہ پودوں پر کچی روٹیاں توڑ کر کھا جایا کرتے تھے۔ مگر اب ہم نے بہت ترقی کر لی ہے۔ ہم نے کھانے پکانے کے کارخانے بنائے ہیں۔ جہاں ان روٹیوں کو پیس کر آٹے کی شکل میں ڈھال لیا جاتا ہے۔ پھر اس میں پانی ملا کر انھیں گوندھ لیا جاتا ہے۔ پھر انھیں حرارت پہنچا کر خشک کر لیا جاتا ہے پھر انھیں خاص مشینوں میں ڈال اس آٹے سے گیہوں کے دانے تیار کیے جاتے ہیں!"

"روٹی سے گیہوں کا دانہ! یہ تو بالکل الٹی بات ہے۔ ہمارے ہاں تو گیہوں کے دانے سے روٹی تیار کی جاتی ہے!"

"احمق! ہمیشہ روٹی سے گیہوں کا دانہ تیار ہوتا ہے۔" وہ بولا۔

"ہمارے ہاں شیر بکری کو کھاتا ہے۔" ناز نے کہا

"الٹا دیس کا بچہ ہنس کر بولا: "کیا الٹا دیس ہو گا۔ تمہارا کل تم کہو گے چوہا بلّی کو نہیں بلّی چوہے کو کھا جاتی ہے!"

"بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہماری زمین پر بلّی چوہے کو کھا جاتی ہے۔"

"بھاگو! بھاگو!" جمی نے پریشان ہو کر کہا: "ہم اس الٹا دیس میں ہرگز نہ رہیں گے۔"

"الٹا دیس کا بچہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ زمین کے بچے ڈر کر الٹا دیس سے بھاگ نکلے۔ بھاگتے بھاگتے وہ لوگ کئی کھیتوں اور جنگلوں کو پار کر گئے آخر وہ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں چاروں طرف ریت ہی ریت تھی اور ریت کے

بیچ بیچ کوئی ایک سو گز کے گھیرے میں ایک بڑی سی چاندی کی طشتری کے پاس پہنچ گئے۔ طشتری کے باہر ایک زینہ تھا۔ بچے پہلے تو بڑی حیرت سے اس طشتری نما چیز کو دیکھتے رہے۔ پھر زینے سے طشتری پر چڑھ گئے۔ طشتری کے بیچ میں پلاسٹک کا ایک ہینڈل لگا تھا جو اندر سے روشن تھا۔ جمی غور سے اس ہینڈل کو دیکھنے لگا اتنے میں اس نے کیا دیکھا کہ دور صحرا میں ندی کنارے سے ریت کے بگولے اڑنے لگے اور دو انسان نما جانور جن کا قد پچاس فٹ سے کم نہ ہوگا، اور جو شکل وصورت سے بالکل دیو معلوم ہوتے تھے، بھاگتے ہوئے طشتری کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"باپ رے!" موہنی ڈر کر بولی۔ "یہ دیو تو ہمیں کچا کھا جائیں گے۔"

جمی نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ بچنے کا کوئی راستہ دکھائی نہ دیا۔ دیو قریب آتے جا رہے تھے اور ان کے بڑے بڑے منہ کھلے ہوئے تھے۔ اور ان کے دانت ہاتھیوں کے دانت سے بھی زیادہ بڑے اور خوفناک دکھائی دیتے تھے۔ دونوں دیو بچوں کو دیکھ کر زور زور سے چلانے لگے، اور زور زور سے بھاگنے لگے۔

یکایک جمی نے زور سے پلاسٹک کے ہینڈل کو گھمایا اور اسی وقت زون کی آواز کرتی ہوئی چاندی کی طشتری اوپر فضا میں اڑ گئی۔ بچوں کو ایک دھچکا سا لگا مگر پھر وہ فوراً سنبھل گئے۔ اڑن طشتری کے اندر سے آواز آئی۔

"خبردار۔ ہوشیار۔ جہاز چاند کو چھوڑ رہا ہے۔ اور مریخ کی جانب بڑھ رہا ہے۔"

"خبردار۔ ہوشیار!! ہینڈل کو بائیں سے دائیں اور دائیں سے بائیں پھر گھماؤ، اور تین مرتبہ کہو، بیچ! بیچ!! بیچ!!!"

جمی نے آواز کے مطابق ہینڈل گھمایا اور بچوں نے تین مرتبہ زخ زخ کیا۔

زخ زخ کی آواز پر اڑن طشتری کا ایک حصہ نیچے گر گیا اور بچے اُڑن طشتری کے اندر جا گرے۔ زمین کے بچے اڑن طشتری کے اندر تھے، اور اُڑن طشتری دو لاکھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے ارض مریخ کی طرف پرواز کر رہی تھی!

دو گھنٹے پرواز کرنے کے بعد اڑن طشتری ایک ایسے علاقے میں پہنچی جہاں دُور نیچے دیکھنے سے چاروں طرف نیلا پانی ٹھاٹھیں مارتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ موہنی خوشی سے تالی بجاتے ہوئے بولی "آہا۔ پانی! پانی!!"

"کوئی سمندر معلوم ہوتا ہے" عرفی نے کہا۔

جمّی جو بہت دور تک دیکھ سکتا تھا۔ بولا "سمندر نہیں ہے۔ ایک بہت بڑی جھیل ہے۔ اور اس کے بیچ میں ایک ٹاپو بھی ہے"

"اور کیا نظر آتا ہے؟" موہنی نے پوچھا۔

"اب اتنی دُور سے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ مگر ٹاپو کا رنگ ہرا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ہریالی تو ضرور ہوگی"

"تو اڑن طشتری زرا نیچے لے جاؤ"

جب وہ اڑن طشتری کو اور نیچے لے گئے تو معلوم ہوا کہ جھیل کے گہرے پانی کے درمیان ایک خوب صورت سا جزیرہ ہے۔ جہاں خوب صورت درخت لہلہا رہے ہیں۔ اور ان درختوں کے درمیان کشادہ کھیت ہیں پھولوں کے

بڑے بڑے باغ ہیں۔ کھیلنے کے لئے وسیع میدان بنے ہوئے ہیں کہیں کہیں پر چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر چھوٹے چھوٹے خوشنما گاؤں ہیں۔ جھیل کے چاروں طرف ایک قلعہ نما اونچی دیوار بنی ہوئی ہے۔ جس کے چاروں کھونٹ چار بڑے بڑے دروازے ہیں۔ ان کے اندر چھوٹی چھوٹی چار بندرگاہیں ہیں۔ ہر بندرگاہ پر چھوٹی چھوٹی کشتیاں ساحل سے لگی کھڑی ہیں۔ کچھ کشتیاں جھیل کی سطح پر تیر رہی ہیں۔ اور ان میں چھوٹے چھوٹے جمی، عرفی، ناز، موہنی اور تیلی کی عمر کے بچے پکنک کر رہے ہیں۔ بینڈ بجا رہے ہیں عرشے پر ڈانس کر رہے ہیں۔ بڑا عمدہ منظر ہے۔

موہنی یہ سب دیکھ کر کھل اٹھی "ہم تو اس جزیرے پر جائیں گے۔ اڑن طشتری نیچے اتارو۔ جلدی سے نیچے اتارو......"

جمی نے اڑن طشتری کا رخ جزیرے کی طرف کر دیا۔ جوں ہی اڑن طشتری چاروں طرف کھنچی ہوئی دیوار کو پار کر کے جھیل کے پانی پر اڑنے لگی۔ چاروں طرف خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ آناً فاناً بہت سی کشتیاں جو ایک لمحہ پہلے ساحل کے کنارے کھڑی تھیں۔ پانی سے اڑ کر ہوا میں اڑن طشتری کے گرد تیرنے لگیں اور ان کشتیوں سے آوازیں آنے لگیں۔

"جزیرے کی طرف مت جاؤ۔ جزیرے کی طرف مت جاؤ۔ پہلے کسٹمز کے گیٹ پر جاؤ۔ واپس لے جاؤ۔ اپنی اڑن طشتری......"

آوازیں ایسی میٹھی اور سریلی تھیں۔ لہجہ اس قدر مہذب اور شستہ تھا کہ بچوں نے فوراً اپنی اڑن طشتری کو ایک گیٹ کی طرف موڑ دیا۔ دوسرے لمحے میں جمی نے اڑن طشتری کو دیوار کے ایک بڑے گیٹ کے سامنے اتار دیا۔

بلند و بالا گیٹ کی محراب پر سونے کے حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔

"بغیر نفرت کا دیس"

"خوش آمدید"

بچے خوشی خوشی آگے بڑھے، محراب کے اندر جب پہنچے تو چاروں طرف سے پندرہ بیس بچوں نے گیت گاتے ہوئے انھیں خوش آمدید کہا۔ اب اتنے قریب آنے پر دیکھا کہ ان بچوں کا رنگ عجیب سا تھا۔ ان سب بچوں کا رنگ سبز تھا۔ جیسے ہرے پتوں کا ہوتا ہے اور ان کے دانت بسنتی رنگ کے تھے۔ آنکھیں نفشئی رنگ کی تھیں۔ اور وہ لال رنگ کے چغے پہنے ہوئے تھے......

ہرے رنگ کے ایک بچے نے آگے بڑھ کے عرفی سے پوچھا۔

"جناب کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

"زمین سے"

"کیا سیر و سیاحت کا ارادہ ہے؟"

"جی ہاں ......"

"تو سب سے پہلے اس چوکی پر اپنا نام اور پتا لکھوایئے۔ یہاں پر آپ کی تلاشی بھی لی جائے گی!"

سب بچوں نے اپنا اپنا پتا لکھ دیا۔ لیکن جب تلاشی کی باری آئی۔ تو زمین کے بچے یہ دیکھ کر بڑے حیران ہوئے۔ کہ ایک ہرے رنگ کا بچہ آگے آیا اور اس نے باری باری سے سب کو سونگھنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے اس نے عرفی کو سونگھا، اور سونگھ کر دوسرے بچے سے بولا!

"یہ تو ٹھیک ہے! اس کے پاس سے نفرت کی بُو نہیں آتی ہے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے!" اُس ہرے رنگ کے بچے نے ناز کو سونگھتے ہوئے کہا۔

موہنی خفا ہو کر چلائی: "توبہ..... ہمیں کوئی سونگھتے تلاشی لینا ہے تو لے لو یہ جانوروں کی طرح سونگھتے کیوں ہو؟"

"یہ بہت شریر ہے! نٹ کھٹ!" ہرے رنگ کے بچے نے دوسرے دو ہرے رنگ کے بچوں سے کہا: "اسے ہماری جھیل میں دو غوطے دو۔"

فوراً دو بچوں نے موہنی کو پکڑ کر پانی میں ڈھکیل دیا۔ دو تین غوطے کھانے کے بعد موہنی پھر کنارے پر آگئی۔ اُسے پھر ان بچوں نے سونگھا۔ بولے: "اب اس کے دل میں نفرت نہیں ہے!"

جمی بولا: "یہ کیا تماشہ ہے؟"

ہرے رنگ کے ایک بچے نے بتایا....... "یہ ہے نفرت کا جزیرہ ہے۔ یہاں پر صرف وہی لوگ آسکتے ہیں یا رہ سکتے ہیں جن کے دلوں میں نفرت نہ ہو۔ دوسرے لوگوں کو ہم اندر آنے کی اجازت نہیں دیتے۔"

"اور جس بے چارے کے دل میں نفرت ہو وہ کیا کرے؟"

"اسے ہم اپنی جھیل کے پانی میں غوطے دیتے ہیں۔ اگر اس کے دل میں معمولی قسم کی نفرت ہوتی ہے تو وہ اس پانی سے دھل جاتی ہے۔ پھر ہم اسے اس جزیرے پر آنے کی اجازت دیتے ہیں! اور اگر نفرت نہیں دھلتی تو اسے نہیں آنے دیتے!"

بچّوں کو اس جزیرے کے اس قانون پر بڑا تعجب ہوا۔ مگر وہ چپ رہے۔ حیرت گزری کہ ہمارے کسی بچے میں ان لوگوں نے کوئی نفرت نہ پائی۔ اس لئے ان لوگوں کو اسی وقت جزیرے پر آنے کی اجازت مل گئی۔

جونہی ہرے رنگ کے بچوں کو معلوم ہوا کہ زمین سے آنے والے بچے صحیح قسم کے بچے ہیں۔ تو وہ لوگ باری باری سے ان کے ہاتھ چومنے لگے۔ اور ان کے چاروں طرف کھڑے ہو کر گیت گانے لگے۔ اور ناچنے لگے۔ ناچ ختم ہونے کے بعد وہ لوگ انھیں ایک کشتی میں سوار کر کے جزیرے پر لے گئے۔

جزیرے پر لے جانے کے بعد کشتی کو ساحل سے لگا کر ان لوگوں نے جمی، عرفی ناز، تیلی، موہنی کو آزاد کر دیا۔ "اب آپ جا سکتے ہیں!" ایک ہرے رنگ کا بچہ بولا۔ "کہاں؟"

"جہاں آپ کا جی چاہے۔ اس پورے جزیرے پر آپ کے لئے کوئی روک ٹوک نہیں ...."

بچے بڑے حیران ہوئے۔ یہ کس طرح کا جزیرہ ہے اور وہ پانچوں سیدھے سیدھے ایک پگڈنڈی پر چل پڑے۔ دونوں طرف خوشنما پھول کھلے ہوئے تھے۔ یہ پگڈنڈی ایک دلفریب اور دلکش گھاٹی کے دامن سے لگی لگی آگے جا رہی تھی۔ پھول ایسے خوش رنگ اور خوش بودار تھے۔ کہ موہنی سے رہا نہ گیا۔ اس نے ایک پھول توڑ کر اپنے بالوں میں لگا لیا۔

پھول لگا کر جب وہ ایک قدم آگے بڑھی تو پیچھے سے آواز آئی "تم نے میرا شکریہ ادا نہیں کیا۔"

موہنی نے حیران ہوکر پیچھے دیکھا مگر اُسے وہاں کوئی بچہ نظر نہیں آیا۔ پریشان ہوکر وہ ایک قدم آگے بڑھی تو پھر آواز آئی "تم میرا شکریہ ادا نہ کروگی" موہنی وہیں رک گئی پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تو پھولوں کا پودا بول رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا۔۔۔۔ "ہمارے ہاں دستور ہے۔ اگر تم کسی سے کچھ لیتے ہو۔ تو اس کا شکریہ ادا کرو!"

"شکریہ!" فوراً موہنی کی زبان سے نکل گیا۔ "عجیب جگہ ہے یہاں پھول بھی بولتے ہیں۔ اور شکریہ ادا کرنا بھول جاؤ۔ تو یاد دلا دیتے ہیں۔ عجیب طرح کا جزیرہ ہے یہ؟"

جمی بولا: "مجھے تو اس جزیرے کی یہی بات پسند آئی۔"

بچے آگے بڑھ گئے۔ کچھ دور چلنے کے بعد انھیں راستے میں ایک گھنے پیڑ کے نیچے ایک خوب صورت رسٹوران نظر آیا۔ جہاں طرح طرح کی چاکلیٹ، ٹافیاں اور پھل وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ ایک طرف رنگا رنگ شربتوں کی صراحیاں تھیں دوسری طرف برف میں لگی ہوئی سوڈا واٹر کی بوتلیں۔ چھوٹی چھوٹی میز کرسیوں پر بیٹھے ہوئے بچے شربت پی رہے تھے۔ یا آئس کریم اور چاکلیٹ کھا رہے تھے اور ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔

اس خوب صورت رستوران میں ہرے رنگ کے بچوں کو کھاتے پیتے دیکھ کر ہمارے بچوں کو بھی زور کی بھوک محسوس ہونے لگی۔۔۔۔ وہ لوگ رسٹوران کے کونٹر کی جانب بڑھ گئے۔ جہاں پر ہرے رنگ کی پلیٹیں رکھی ہوئی تھیں اور ایک طرف ہرے رنگ کا ایک لڑکا بھی کھڑا اپنے ہنستی دانتوں سے ان کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا

"خوش آمدید" وہ بڑی میٹھی آواز میں بولا۔ موہنی بولی: "ہمیں بھوک لگی ہے۔"

وہ ہرے رنگ کا لڑکا بولا: "سب کچھ حاضر ہے۔ جو جی چاہے کھالو...."

طرح طرح کی چاکلیٹوں، مٹھائیوں اور ٹافیوں سے بچوں نے اپنی جیبیں بھر لیں صراحیوں سے انڈیل کر میٹھے میٹھے شربت پئے۔ اور خوب سیر ہو کر جب چلنے لگے۔ تو وہی سبز رنگ کا لڑکا بولا۔

"بل تو آپ نے ادا نہیں کیا ہے!"

"جو کچھ ہم نے لیا ہے اس کی قیمت کیا ہو گی؟" جمی نے پوچھا۔ وہ ہرے رنگ کا لڑکا بولا: "پچاس بوسے!"

"پچاس بوسے؟" ناز حیرت سے چیخ کر بولی: "یہ کس طرح کا بل ہے؟"

"ہمارے ہاں اسی طرح چیزوں کی قیمت وصول کی جاتی ہے..... ہر چیز کے لئے الگ الگ بوسوں کی تعداد مقرر ہوتی ہے... جو چیز لو اس کے اتنے ہی بوسے دینے پڑتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ نے پچیس ٹافیاں لی ہیں۔ آپ کو پچاس بوسے دینے پڑیں گے..... ہمارے ہاں ایک ٹافی کی قیمت دو بوسے ہیں!"

"دو بوسے میں دوں گی؟" ناز حیرت سے بولی۔

وہ ہرے رنگ کا لڑکا بولا: "ہاں آپ کو دو بوسے میری ناک پر دینے پڑیں گے۔"

"میں تو تمھاری پکوڑا سی ناک پر ایک بوسہ بھی نہ دوں گی!" ناز غصے سے بولی۔ اور آگے کو چلنے لگی۔ دوسرے بچے بھی اسی کے ساتھ آگے کو بڑھ گئے۔ مگر انھیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ پھر ہرے رنگ کے بچے نے ان سے کچھ نہیں کہا۔ مگر جب وہ چند قدم آگے بڑھے، تو یکایک سامنے کے راستے پر بڑی بڑی

خاردار جھاڑیاں اُگ آئیں اور بچوں کے آگے راستہ روک کے کھڑی ہو گئیں۔
بچے ان جھاڑیوں سے بچ کر جدھر جاتے، اُسی طرف جھاڑیاں ان کے سامنے آجاتیں۔ وہ داہنی طرف مڑتے تو جھاڑیاں بھی اسی طرف جاتیں بائیں طرف جاتے تو وہی جھاڑیاں بائیں طرف آکے کھڑی ہو جاتیں۔ سیدھے چلتے تو جھاڑیاں آہستہ آہستہ ان بچوں کی طرف آگے بڑھنے لگتیں۔ بچے پریشان ہو گئے اور چیخ مار کر پیچھے ہٹے اور ہٹتے ہٹتے واپس رستوران کے کاؤنٹر پر پہنچ گئے۔ وہی ہرے رنگ کا بچہ ان کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اُس بچے نے بڑے میٹھے لہجے میں کہا،
"میری ناک پر پیسے دے دو۔ میں تم سے پہلے ہی کہتا تھا...."
جلدی جلدی پچاس پیسے اس کے ناک پر دیئے گئے۔ اور پچاس پیسے پر جونہی بچوں نے راستے کی طرف دیکھا تو انھیں معلوم ہوا کہ راستے کی ہر خاردار جھاڑی غائب ہو چکی ہے۔ اور پہلے جہاں پر جھاڑیاں تھیں وہاں اب صرف پھول ہی پھول ہیں.....
"اونہہ! یہ کیا دیس ہے؟" موہنی روہانسی ہو کر بولی۔
جمی نے ہنس کر کہا "تجھے تو ان کی یہ سزا اچھی پسند آئی!"
بچے آگے بڑھتے گئے۔ پگڈنڈی گھاٹی در گھاٹی چلی جا رہی تھی۔ اور ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ نہ ابھی تک راستے میں کوئی گاڑی نظر آئی تھی۔ البتہ کہیں کہیں کھیت ضرور نظر آجاتے تھے۔ اور اُن میں چھوٹے چھوٹے بچے مشین چلاتے ہوئے کام کر رہے تھے.....
آخر جب چلتے چلتے بچے بالکل تھک گئے۔ تو ایک کھیت کے کنارے

بیٹھ گئے۔ اس کھیت کے کنارے ایک بچہ مکّا کے بھُنے ہوئے بھٹے بیچ رہا تھا۔

عرفی نے پوچھا: "ایک بھٹے کے کتنے پیسے لیتے ہو؟"

"چار بوسے!" وہ بچہ آہستہ سے بولا۔ اس کی ناک بہت بڑی تھی۔ دور سے بالکل گوبھی کا پھول معلوم ہوتی تھی۔

"میں ایک بوسہ دوں گی!" موہنی شرارت سے بولی۔

"میں تم سے دس بوسے لوں گا۔"

"یہ کیوں؟"

"ہمارے ہاں کا دستور ہے۔ جو بھاؤ تاؤ کرتا ہے اس سے زیادہ رقم وصول کی جاتی ہے۔"

چناں چہ باقی بچوں کو چار بوسوں کے عوض ایک بھٹا ملا۔ مگر موہنی کو ایک بھٹے کے لئے دس بوسے اس بدصورت لڑکے کی گوبھی کے پھول کی سی بڑی ناک پر دینے پڑے۔ اس پر سب بچوں نے مل کر اس کا خوب مذاق اڑایا۔

بھٹے کھا کر عرفی نے پوچھا: "یہاں کوئی موٹر نہیں ہے۔"

"نہیں۔"

"کوئی تانگہ؟"

"نہیں۔"

"کوئی رکشا؟"

"نہیں۔"

"تو پھر کیا پیدل چلنا پڑے گا اس سڑک پر؟"

"سبھی چلتے ہیں!"

"اور تھکتے نہیں؟"

"نہیں!"

"یہاں سے پہلا گاؤں کتنی دُور ہے!"

"کوئی سو میل دُور ہو گا۔"

"سو میل؟ باپ رے!" ناز خفا ہو کر بولی۔

"سو میل پیدل کیسے چلا جائے گا؟"

"بہت آسان ترکیب ہے!" بھٹے بیچنے والے لڑکے نے کہا: "آپ اگلے موڑ پر پہنچ کے میل کا ایک پتھر دیکھیں گے۔ اس پر تمام گاؤں کے نام اور فاصلے لکھے ہوئے ہیں۔ جس گاؤں میں جانا ہو۔ ان کے نیچے کا بٹن دبا دیجئے بس سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ٹھیک کیا ہو جائے گا! کیا کوئی ہیلی کاپٹر ہمیں اڑا کر لے جائے گا؟" جمی نے پوچھا۔

"آپ بٹن دبا کر تو دیکھیں؟" بھٹے بیچنے والے نے مسکرا کر کہا،

اگلے موڑ پر پہنچ کر بچوں نے دیکھا کہ پگڈنڈی کے کنارے ٹیلی ویژن کے سیٹ کی طرح ایک صاف شفاف میل کا پتھر لگا ہے۔ جس پر لکھا ہے:۔

ہمارا گاؤں .... سو میل

پیارا گاؤں .... ڈھائی سو میل

دلارا گاؤں .... تین سو میل

راج دھانی   پانچ سو میل

جمی نے پوچھا: بولو۔ بہنو بھائیو۔ کہاں کا بٹن دباؤں؟"

"کہیں بٹن دباتے ہی کانٹے والی جھاڑیاں تو نہ آجائیں گی؟" موہنی خوف زدہ ہو کر بولی: "عجیب جزیرہ ہے"

تتلی بولی: میرے خیال میں تو سیدھے راجدھانی چلنا چاہیے۔ مجھے تو سخت بھوک لگی ہے۔ اور مجھے کہیں موتی نظر نہیں آتے؟"

جمی نے راج دھانی کا بٹن دبایا......

کچھ بھی نہیں ہوا۔

جمی نے پھر بٹن دبایا۔

پھر کچھ نہیں ہوا۔

"میرے خیال میں وہ شریر لڑکا مذاق کرتا تھا....."

"نہیں مذاق نہیں ہے!" میل کے پتھر سے آواز آئی: "آپ نے میرا شکریہ تو ادا ہی نہیں کیا ہے۔ اور یہاں ادائیگی کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا"

"شکریہ.... شکریہ...... سو بار شکریہ ......" تتلی جلدی سے بولی۔

ایک دم سڑک کے اندر سے گھوں گھوں کی آواز آنے لگی۔ اور جیسے پہیے تیز رفتاری سے زمین کے نیچے چل رہے ہوں، یکایک سڑک سو میل فی منٹ کی رفتار سے دوڑنے لگی، اور بچے گرتے گرتے بچے۔

ہائے! یہ تو سڑک چل رہی ہے......" نانو بڑی حیرت سے بولی

واقعی اب سڑک بڑی ہی تیز رفتاری سے گھاٹی پر چل رہی تھی، جیسے سبزے پر کوئی تیز سا فیتہ کھینچتا چلا جائے......

"کیسا عجیب جزیرہ ہے!" عرفی بولا "یہاں کی سڑکیں چلتی ہیں جب جی چاہے خود پیدل چلو۔ جب تھک جاؤ تو بٹن دبا کر سڑک کو چلالو۔"

"مجھے تو مزا آگیا!" جمی نے تعریف کرتے ہوئے کہا،

"سچ مچ یہ جزیرہ بہت پسند آرہا ہے۔"

اگلے پانچ منٹ میں سڑک نے فاصلہ طے کرکے ہمارے بچوں کو جزیرے کی راج دھانی میں پہنچا دیا۔

جزیرے کی راج دھانی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے ایک لمبے سلسلے پر آباد تھی۔ اور شہر کے بجائے ایک پھیلے ہوئے ماڈرن گاؤں سے ملتی جلتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے خوشنما گھر پہاڑیوں، ٹیلوں، گھاٹیوں اور وادیوں پر ایک دوسرے سے دور دور آباد تھے۔ ہر گھر کے ارد گرد ایک وسیع باغیچہ اور بچوں کے کھیلنے کے لئے ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ شہر کی تمام سڑکیں اور پگڈنڈیاں خودبخود چلتی تھیں۔ اور مختلف چوراہوں پر آکر خودبخود رُک جاتیں۔ جہاں انھیں باری باری سے آگے بڑھنے کے لئے راستہ مل جاتا تھا۔ بچے شہر کے ایک بڑے چوراہے پر آکر رُک گئے۔ جہاں پانچ سڑکیں آکے ملتی تھیں، ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ اب وہ کدھر جائیں۔ چند لمحے انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر قریب کی ایک سڑک پر کھڑے ہوئے بچے کو دیکھا۔ جو ان کی مخالف سمت کو جا رہا تھا۔ وہ بچہ زمین کے بچوں کو دیکھ کر مسکرایا۔ اس نے پوچھا: "فرمایئے۔ آپ کو کہاں جانا ہے؟"

اس بچے کو زمین سے لاکھوں میل دور اردو میں بات چیت کرتے دیکھ کر جمی، عرفی اور دوسرے بچوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ آخر نانے سے نہ رہا گیا۔ تعجب

سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
"تم نے ہماری زبان کیسے سیکھی؟"

"اپنی بہن سے!"
"تمھاری بہن نے کہاں سے سیکھی؟"
"وہ تمھارے دیس سے سیکھ کر آئی ہے!"
"تمھاری بہن ہمارے دیس گئی تھی؟" موہنی چیخ کر بولی۔ "جھوٹ بولتے ہو تم؟"
"نہیں۔ بالکل سچ کہتا ہوں۔" وہ لڑکا خود اعتمادی سے بولا۔
"کدھر ہے تمھاری بہن! دکھاؤ ہمیں،" موہنی نے چیلنج کرتے ہوئے اس سے کہا۔

"اچھا۔ میری سڑک پر آجاؤ۔ پھر میں تمھیں وہاں لے چلوں۔"
وہ لوگ اپنی سڑک چھوڑ کر دوسری سڑک پر آگئے جہاں وہ بچہ کھڑا تھا۔ اسی وقت وہ دوسری سڑک چلنے لگی۔ اور وہ لوگ بھی اُس اردو بولنے والے بچے کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔
موہنی نے پوچھا "تمھارا نام کیا ہے؟"
"بنٹو!" بچے نے جواب دیا۔
نازنے پوچھا۔۔۔ "اور تم کتنی زبانیں جانتے ہو؟"
"دس!"

"دس زبانیں؟" جمی نے حیرت سے دریافت کیا۔ "اس چھوٹی سی عمر میں

تم نے اتنی زبانیں کیسے سیکھ لیں؟"

"میری بہن نے سکھائی ہیں!" میری بہن۔ اس دنیا کی ساری زبانیں جانتی ہے۔" بیلو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر بھی اس چھوٹی سی عمر میں اتنی زبانیں سیکھ لینا بہت مشکل ہے" عرفی نے کہا: "کیا تمھاری بہن کسی سکول میں پڑھاتی ہیں؟"

"بیلو مسکرا کر بولا: "نہیں وہ کسی سکول میں نہیں پڑھاتیں۔ کیوں کہ ہمارے ہاں سکول نہیں ہوتے؟"

"سکول نہیں ہوتے؟" نازحیرت سے بولی: "تو پھر تم لوگ پڑھتے کیسے ہو؟"

"تکیے سے!" بیلو نے جواب دیا۔

"تکیے سے کیسے؟" موہنی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا،

بیلو نے کہا "میرے گھر چلو۔ پھر سب کچھ بتاؤں گا۔"

وہ لوگ بڑی بے چینی سے بیلو کے گھر کا انتظار کرنے لگے، بیلو انھیں مختلف سڑکوں پر گھماتا ہوا شہر کے مختلف حصوں کی سیر کراتا ہوا ایک اونچی پگڈنڈی پر لے گیا۔ جو راجدھانی کی سب سے اونچی پہاڑی پر واقع تھی۔ اس کی چوٹی پر ایک بہت خوب صورت گھر بنا ہوا تھا۔

یہ گھر بالکل آٹومیٹک تھا۔ گھر کے دروازے قدموں کی آہٹ سے کھل جاتے تھے اور پھر خود بخود بند ہو جاتے تھے۔ روشنی کا انتظام بھی آٹومیٹک تھا۔ جوں جوں دن کی روشنی کم ہوتی تھی کمروں کی روشنی خود بخود بڑھنے لگتی تھی۔ نہ کوئی بلب تھا، نہ کہیں بجلی کے تار نظر آتے

تھے۔ صرف سوتے وقت اندھیرا کرنے کے لئے سوچ دبانا پڑتا تھا۔ اندھیرا کرنے کے لئے مختلف سوئچ تھے۔ کوئی کم اندھیرا کرنے کے لئے، کوئی زیادہ اندھیرے کے لئے، کوئی بالکل ہی اندھیرا کر دینے کے واسطے۔

بیلو بچوں کو ایک بڑے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ اور انھیں جا کر اس نے ایک بڑی میز کے گرد بٹھا دیا۔ پھر اس نے باری باری ہر ایک سے پوچھا۔ "آپ کیا پئیں گے؟"

جمی بولا: "پیٹرول!"

تیلی بولی: "میں تو بجلی میں بھنے ہوئے موتی کھاتی ہوں۔"

ناز بولی: "مجھے سنگتروں کا رس چاہیئے۔"

موہنی بولی: "مجھے پائین ایپل جوس پلا دو۔"

عرفی نے کہا: "میں آم کا رس پیوں گا۔"

بیلو نے میز کے گرد تین چار بٹن دباتے ہوئے کہا: "باقی چیزیں تو ابھی آجائیں گی۔ لیکن پیٹرول اور موتیوں کے لئے وقت لگے گا۔"

"کیوں؟" جمی بولا۔

"ہمارے ہاں پٹرول کوئی نہیں پیتا......" بیلو بولا: "تم نے دیکھا ہوگا ہمارے ملک میں ایک موٹر گاڑی بھی نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں ہے؟" موہنی نے پوچھا۔

"اس لئے کہ موٹروں کے چلنے سے بہت ایکسی ڈنٹ ہوتے تھے۔ اور بہت سے لوگ مرجاتے تھے۔ اس لئے ہم نے موٹروں کی جگہ پر سڑکوں کو چلانا شروع کر دیا ہے۔

اب ایک بھی ایکسی ڈنٹ نہیں ہوتا"

"واقعی موٹر بڑی خطرناک اور پرانی چیز ہوگئی ہے۔"

تتلی بولی "آج تک کسی نے اس طرف غور ہی نہیں کیا۔ بجائے موٹر گاڑی کے اگر چلتی ہوئی سڑکیں بنا دی جائیں جس طرح زمینوں میں اترنے کے لئے چلتی ہوئی سیڑھیاں بنائی جاتی ہیں۔ تو سفر کرنا کتنا آسان اور محفوظ ہو جائے"

"تمہارا شہر بڑا عجیب ہے" عرفی بولا "ہم نے تمہارے شہر میں کوئی بازار نہیں دیکھا......"

"بازار کی کیا ضرورت ہے؟" بیلو بولا "یہاں بٹن دبانے سے گھر میں ہر چیز خود بخود آجاتی ہے"

"کہاں سے آتی ہے؟"

"ہمارے ہاں شہر کے نیچے زمین کے اندر بڑے بڑے کارخانے اور ڈیپارٹمنٹ سٹور ہیں وہاں سے سب چیزیں آتی ہیں"

"کارخانوں میں کیا تیار ہوتا ہے؟"

"کھانے پینے کی چیزیں۔ کپڑا، عمارت کا سامان۔ سینما کی کتابیں!"

"سینما کی کتابیں!" موہنی نے پوچھا "تمہارا مطلب ایک آنے والی گاؤں کی کتابوں سے ہوگا۔ جو ہمارے ملک میں ملتی ہیں!"

"نہیں یہ کتابیں ہوتی ہیں۔ انھیں پڑھنے کے بجائے دیکھا جاتا ہے۔" بیلو بولا" اور پھر اس نے میز کے گرد ایک بٹن دبایا۔ اور بٹن دباتے ہی دوسرے کمرے سے چل کر ایک ٹرالی اس کے پاس پہنچ گئی جس پر ایک کتاب رکھی تھی۔

کتاب کھولتے ہی سینما شروع ہو گیا۔ یہ کتاب خود بخود بولتی اور تصویریں دکھاتی چلی جاتی تھی۔ بچے اس کتاب کو دیکھ کر بڑے حیران ہوئے۔

بیلو نے کہا "ہمارے ہاں ہر موضوع پر سینما کی کتاب ملے گی۔ اس سے گھر بیٹھے ہی سب کچھ یاد ہو جاتا ہے۔ اور جو سینما کی کتاب سے یاد نہ ہو سکے اسے تکیے سے یاد کرایا جاتا ہے۔"

"تکیے سے کس طرح؟" موہنی نے پھر پوچھا۔

اب اتنے میں میز کے گرد سب کے لئے پینے کی چیزیں میز کے اندر سے نکل کر ہر ایک کے سامنے آ چکی تھیں۔ حتیٰ کہ بجلی سے چارج کئے ہوئے موتی اور پیٹرول بھی موجود تھا۔

بیلو نے کہا، "آپ لوگ کچھ پی لیجیے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے آرام کر لیجیے۔ تو میں آپ کو اپنی بڑی بہن کے گھر لے چلوں گا۔"

"تمھاری بڑی بہن کہاں رہتی ہے؟"

"وہ باہر باغ میں رہتی ہے۔" بیلو بولا "مگر پہلے آپ لوگ آرام کر کے تازہ دم ہو جائیں۔ تو میں پھر ان سے آپ کی ملاقات کا وقت لے لوں گا۔ میری بہن بے حد مصروف رہتی ہیں۔ لہٰذا جو وقت وہ بتائیں گی، اس وقت ان کے پاس چلنا ہو گا۔"

شربت وغیرہ پی کر بیلو اپنے مہمانوں کو آرام کرنے کے مختلف کمروں میں لے گیا۔ بستر پر دراز ہوتے ہی اور تکیے پر سر رکھتے ہی بچوں کو میٹھے میٹھے گیت سنائی دینے لگے۔ اور انھیں نیند آنے لگی۔ چند منٹ میں وہ سب سو گئے۔

بیلو انھیں دیکھ کر مسکراتا رہا اور جب وہ لوگ گہری نیند سو گئے تو اس نے ہر ایک کے تکیے کے قریب جا کر ایک سوچ دبایا اور آہستہ سے کہا۔

"انھیں سوتے میں ہمارے جزیرے کی زبان سکھا دی جائے!"

دو گھنٹے کے بعد جب زمین کے بچے اٹھے تو انھیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اب وہ سب بڑی آسانی سے بیلو کے ساتھ اردو زبان میں نہیں بلکہ اس کے اپنے جزیرے کی زبان میں گفتگو کر رہے تھے.....

"یہ کیسے ہوا؟" عرفی نے اچنبھے سے پوچھا۔

"ہمارے سائنس دانوں نے دریافت کیا ہے۔" بیلو بولا۔ "کہ اگر عالم خواب میں بچوں کے دماغ میں کوئی بات ڈال دی جائے تو وہ بڑی آسانی سے ذہن نشین ہو جاتی ہے اور کبھی بھلائی نہیں جا سکتی۔ اس لئے ہم نے سکھانے پڑھانے کا یہ نیا طریقہ ایجاد کیا ہے۔ جو کچھ سکھانا ہوتا ہے اسے بجلی کے کوڈز میں ڈھال کر اس تکیے کے اندر لگا دیتے ہیں۔ سوتے وقت انسانی دماغ میں وہ سارا علم خود بخود منتقل ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے دو گھنٹے میں ایک زبان سیکھی جا سکتی ہے!"

"کمال ہے!" نازی کی آنکھیں حیرت سے کھلنے لگیں۔ بیلو بولا۔ "اس طریقے سے ہمارے بچے چھوٹی سی عمر میں بہت سی زبانیں اور علوم سیکھ جاتے ہیں۔ اس جزیرے کے بچے بہت پڑھے لکھے اور ہوشیار ہیں۔ ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق چھ سات کام خود بخود سیکھ لیتا ہے۔ اور آٹھ برس کی عمر تک اسے اتنا علم حاصل ہو جاتا ہے جتنا زمین کے لوگوں کو پچاس برس میں بھی حاصل نہیں ہوتا ہوگا!"

عرفی نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا: "تم لوگ دن میں کتنے گھنٹے کام کرتے ہو؟"

بیلو بولا: "وقت کی کوئی قید نہیں ہے۔ یہ انسان کی اپنی مرضی پر منحصر ہے۔ چاہے

تو بارہ گھنٹے کام کرے چاہے تو بارہ منٹ بھی نہ کرے ......"

"بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے!" عرفی بولا: "اگر سب لوگ صرف بارہ منٹ ہی کام کریں تو اس جزیرے میں زندہ رہنا محال ہو جائے ......"

"نہیں،" بیلو نے مسکرا کر کہا: "ہم نے ایسا بندوبست کر لیا ہے کہ کم کام کرنے سے جزیرے کی عام زندگی میں کسی طرح کا خلل نہ ہوگا۔"

"وہ کیسے؟"

بیلو بولا: "اس جزیرے کے باشندوں کو کھانے کے لئے جتنی خوراک چاہیئے وہ ہم زمین دوز آٹومیٹک کارخانوں میں تیار کرتے ہیں جتنا کپڑا چاہیئے گھر کے لئے جتنا ضروری سامان چاہیئے وہ سب ہم لوگ آٹومیٹک مشینوں سے تیار کر رہے ہیں۔ جن پر ایک آدمی بھی کام نہیں کرتا.... اس لئے اگر اس جزیرے کے بچے کام نہ کریں جب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ فرق وہاں پڑتا ہے جہاں خوراک حاصل کرنے کے لئے زمین میں ہل چلانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اور کپڑے کے لئے روئی اگانے یا بھیڑیں پالنے کی ضرورت ہوتی ہے ہم تو تمام خوراک کیمیاوی طریقے سے مٹی ہی سے کارخانے میں تیار کرتے ہیں۔ اور سارا کپڑا اسی طریقے سے مٹی سے بن لیتے ہیں۔ اب ہماری تمام بنیادی ضرورتیں نہایت فراوانی سے مٹی سے حاصل کی جاتی ہیں۔ اور آٹومیٹک طریقوں سے ہمارے ہاں ایسی مشینیں کام کر رہی ہیں جنھیں پچاس برس میں شاید ایک بار بھی دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اس لئے تم لوگ تو اب کام کرتے نہیں ہوگے۔"

"نہیں ہم لوگ ہر روز کئی گھنٹے کام کرتے ہیں۔ مگر اب ہم کام کے غلام نہیں ہیں کام ہمارے لئے ایک کھیل ہے۔ ایک مسرت ہے۔ زندگی میں خوشی کا ایک سہارا ہے۔

اور چوں کہ اب ہم کام کے غلام نہیں ہیں۔ اس لئے اب ہر کام کو پہلے سے زیادہ ذمے داری سے کرتے ہیں۔ خوشی سے کرتے ہیں۔ اور اس سے سو گنا زیادہ لطف اٹھاتے ہیں۔

جمی بولا: "تمھارے شہر میں میں نے کوئی فوج نہیں دیکھی۔ پولیس کا ایک سپاہی تک نہیں ملا۔"

"فوج کی تو وہاں ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں ایک دوسرے سے نفرت ہوتی ہو۔ یہ تو "بے نفرت" کا دیس ہے۔ یہاں فوج کا کیا کام؟ اور پولیس کی وہاں ضرورت ہوتی ہے جہاں ایک دوسرے کا حق مارا جاتا ہو۔ یہاں ہر بچے کو اتنا آرام حاصل ہے کہ اسے کسی دوسرے کا حق چھیننے کی ضرورت ہی نہیں۔ تو پھر پولیس ہم لوگ کیوں رکھیں؟" اب بیلو نے حیران ہو کر زمین کے بچوں سے پوچھا۔

"اگر کوئی کسی کو جان سے مار دے تو کیا ہوتا ہے؟" جمی نے پوچھا۔

"کوئی کسی کو جان سے مارے ہی کیوں؟" بیلو نے جواب دیا۔ "ہمارے ہاں تو کبھی کوئی قتل نہیں ہوتا۔۔۔۔"

"فرض کر لو۔" جمی بولا۔ "میں باہر سے آکر تم لوگوں پر حملہ کر دوں تو؟"

"تم حملہ کیوں کرو گے بھلا؟" بیلو نے پوچھا۔ "تمھیں کیا چاہیئے۔ مکان؟ وہ ہم مفت دیتے ہیں۔ کھانا؟ جتنا چاہے کھالو۔ کپڑا؟ جتنا چاہے پہن لو۔ تعلیم؟ وہ یہاں مفت ہے۔ دوا؟ وہ یہاں مفت ہے۔ پھر تمھیں کیا چاہیئے؟"

"طاقت!" جمی نے اپنا آہنی بازو اٹھا کر کہا۔

"طاقت کیا ہوتی ہے؟" بیلو نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ "ہم لوگ طاقت نہیں جانتے۔۔۔ ہم "بے نفرت" کے بچے ہیں۔ ہم صرف محبت جانتے ہیں!"

جمی شرمندہ ہو گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ نیچے گرا دیا۔ اور آہستہ سے بولا۔

"عجیب ملک ہے یہ؟ عجیب قسم کے بچے ہو تم..... چلو ہمیں اپنی بہن سے ملا دو۔ جس نے تمھیں یہ عجیب و غریب تعلیم دی ہے!"

"وہ صرف میری ہی بہن نہیں ہے۔" بیلو نے فخر اور غرور کے ملے جلے جذبات سے کہا۔ "تم لوگ یہیں ٹھہرو۔ میں ابھی اس سے ملاقات کا وقت لے کر آتا ہوں...."

چند منٹ کے بعد ہی بیلو واپس آ گیا۔ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ آتے ہی تالی بجا کر بولا: "میری بہن تمھیں بلاتی ہے ابھی بلاتی ہے۔ بڑے خوش قسمت ہو تم لوگ.... میری بہن نے تمھیں ابھی بلا لیا ہے۔ ورنہ اس سے ملاقات کرنے کے لئے کئی کئی دن انتظار کرنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ میری بہن ہر وقت مصروف رہتی ہے۔"

خوب صورت پھولوں والے خطوں اور نیلے سنگریزوں والی روشوں پر سے گزرتے ہوئے وہ ایک آلوچے کے پیڑ کے قریب پہنچے جو گلابی پھولوں سے لدا پھندا تھا اس پیڑ کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے لکڑی کے بنچ لگے ہوئے تھے جن پر بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے بیٹھے ہوئے تھے۔ فضا میں دھیمی دھیمی موسیقی کی گونج تھی اور چاروں طرف پانی کے چھوٹے چھوٹے فوارے چل رہے تھے۔

وہ لوگ ان کے ساتھ باہر باغ میں چلے گئے......

عرفی نے پوچھا: "مگر تمھاری بہن کہاں ہے؟"

"دیکھو!" بیلو نے آلوچے کی ایک شاخ کی طرف اشارہ کیا۔

بچوں نے گھبرا کر اوپر دیکھا۔ تو انھیں بیلو کی بہن تو نہ دکھائی دی۔ البتہ آلوچے

کی اُس شاخ پر سفید پروں والی ایک خوب صورت کبوتری دکھائی دی جس کے سر پر کنول کے پھولوں کا تاج تھا...... اس کے دائیں بائیں دو چھوٹے چھوٹے کبوتر تھے جو اس کے بچے معلوم ہوتے تھے۔ کیوں کہ وہ ان کے پر بھی بالکل سفید تھے۔ اور ان کے سروں پر بھی اسی طرح کے چھوٹے چھوٹے کنول کے پھولوں کے تاج تھے.....

موہنی دیکھ کر چلا اٹھی "ہماری فاختہ..... !

امن کی فاختہ !"

عرفی بولا: "ہاں وہی تو ہے۔ جسے ڈھونڈنے کے لئے ہم یہاں تک آئے تھے:

وہی سفید پر اور سر پر کنول کا تاج !

"یہ ہماری بہن ہے......" بیلو نے فخر سے کہا۔

"یہ سب بچوں کی بہن تو..... واقعی..... ہم سب کی بہن ہے......"

عرفی بولا۔

جمی نے آہستہ سے کہا: "بہن ہم تمھیں لینے آئے ہیں جس دن سے تم ہم سے روٹھ کر چلی آئی ہو۔ ہماری زمین تباہ و برباد ہو رہی ہے۔"

"اور اگر ہماری بہن ہمیں چھوڑ جائے گی تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔" بیلو اپنی آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے بولا۔ "تم ہمیں چھوڑ کر کہیں نہ جانا بہن !"

"اگر تم ہمارے ساتھ نہ چلوگی تو ہماری پیاری زمین پر ایک انسان بھی زندہ نہ بچے گا۔" ناز نے انتہائی لجاجت سے کہا،

کبوتری بولی: "میں تو آنا نہ چاہتی تھی، مگر تم لوگوں نے خود ہی لڑ بھگڑ کر کے مجھے یہاں آنے پر مجبور کر دیا......"

"ہم شرمندہ ہیں" جمی سر جھکا کے بولا "... اب کبھی تمہاری بات سے منہ نہ موڑیں گے۔ اب کبھی خون خرابہ نہ کریں گے۔ اب ہمارے ساتھ چلو۔ ہماری زمین کو برباد ہونے سے بچالو....."

"چاہے ہمارا پیارا جزیرہ تباہ ہو جائے!" بیلو آزردہ ہو کر بولا۔

"یہ بے نفرت کا جزیرہ تو میرا اپنا ہے" چڑیا بولی۔ "اور اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے لیکن زمین کے بچوں کی آرزو بھی پوری کرنا چاہتی ہوں۔ بچوں کا کہا تو میں ٹال ہی نہیں سکتی....."

"تو دونوں جگہ تم کیسے رہ سکتی ہو بہن؟" بیلو نے پوچھا۔

فاختہ چپ ہو گئی۔ آخر سوچ سوچ کر بولی "زمین کے بچو۔ تم میرے یہ دونوں بیٹے لے جاؤ۔ ایک بیٹا صلح کا ہے۔ دوسرا رواداری کا ہے..... پہلے تم ان دونوں بیٹوں کو لے جاؤ۔ اور ان کا کہا مانو۔ اور اگر تم نے ان کا کہا مانا۔ اور ان کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کیا تو میں تم سے وعدہ کرتی ہوں۔ کہ میں بہت جلد تمہارے پاس آجاؤں گی۔"

اتنا کہہ کر فاختہ نے اپنے بیٹوں کو اشارہ کیا اور اشارہ پاتے ہی وہ دونوں چھوٹے چھوٹے کبوتر آلیچ کی پھولوں بھری شاخ سے اُڑ کر بچوں کے پاس چلے آئے۔ ایک کبوتر موہنی کے کندھے پر بیٹھ گیا۔ دوسرا عرفی کے کندھے پر اور جونہی ان کبوتروں نے ان کے کندھے پر بیٹھ کر اپنے پر پھڑپھڑائے ہوا میں ایک نغمہ سا لہرانے لگا اور بچوں کو محسوس ہوا جیسے وہ سب کے سب اس گیت کی لہر پہ ہوا میں اڑتے ہوئے جزیرے سے باہر چلے جا رہے ہیں۔

بہت جلد ان لوگوں کو اپنی اڑن طشتری مل گئی۔ اور وہ سب بچے ان دونوں کبوتر بچوں کو لے کر اس اڑن طشتری میں سوار ہوئے اور لاکھوں میل کی رفتار سے زمین کی طرف واپس آنے لگے ......

مگر اب کے اس سفر میں ایک عجیب بات یہ بھی تھی کہ وہ لوگ جدھر سے گزرتے تھے ادھر سے میٹھے میٹھے نغموں کی گونج سنائی دیتی تھی۔ اور چاروں طرف سے اڑن طشتری پر پھولوں کی بارش ہوتی تھی۔

جب وہ ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی پر پہنچے۔ تو ان دونوں کبوتروں نے مل کر گانا شروع کیا۔ پر امن اور حسین صلح و آشتی، رواداری اور محبت کا ایک ایسا حسین نغمہ تھا کہ اسے سنتے ہی زمین کے لوگوں کے دلوں سے ایک دوسرے کی نفرت مٹنے لگی .... جیسے صدیوں کی غلاظت دھوئی جا رہی ہو۔ جوں جوں وہ گیت اونچا ہوتا گیا۔ سمندر کا پانی دھرتی سے نیچے ڈھلتا گیا۔ پھر پہاڑوں کے نیچے گھاٹیاں اور گھاٹیوں کے نیچے وادیاں اور وادیوں کے نیچے میدان اور شہر نمودار ہونے لگے۔ پھر کھیتوں میں ہل چلنے لگے۔ اور دریاؤں میں کشتیاں چلنے لگیں اور سڑکوں پر لاریاں دوڑنے لگیں۔ اور جو زمینیں بنجر تھیں وہ ہریالی سے بھر گئیں۔ جو ٹہنیاں سوکھی تھیں ان میں پھول آگئے اور ساری دنیا کے سارے باغ محبت کرنے والوں سے بھر گئے۔ اور امن اور چین کی اس نئی دنیا میں ہمارے بچے جمی اور عرفی، ببلو اور ناز، موہنی اور تیلی آرام و سکون سے رہنے لگے۔

*** ختم شد ***